انتخاب
خطوط غالب
اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات: ۳۶۰

انتخاب
خطوطِ غالب

اُترپردیش اُردو اکادمی
لکھنؤ

انتخاب خطوط غالب

مجلسِ مُشاورت

پروفیسر محمود الٰہی ، پروفیسر شبیہ الحسن

پروفیسر قاضی عبدالستّار ، پروفیسر عقیل رضوی

پروفیسر حکم چند نیّر

دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء

تعداد دو ہزار

قیمت تین روپے

مشیر احسن، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس نیلکو پرنٹرس اینڈ پبلشرز، بلند باغ، لکھنؤ سے چھپوا کر اکادمی کے دفتر قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

مکتوب نگاری غالب کی فطرت ثانیہ تھی۔ انہیں اس فن سے اتنی دلچسپی تھی کہ اسی موضوع پر فارسی میں ایک رسالہ ان کی یادگار ہے، انہوں نے فارسی میں بھی خطوط لکھے اور اردو میں بھی۔ ان کے اردو خطوط میں جس طرز نو کی نشاندہی کی جاتی ہے، اس کی ابتدا وہ فارسی خطوط میں کر چکے تھے۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ غالب کے خطوط، وہ فارسی میں ہوں یا اردو میں، مکتوب نگاری کی روش عام کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔

مکاتیب غالب کے انتخابات شائع ہوتے رہتے ہیں، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ خطوط غالب مختلف امتحانات کے نصاب میں شامل کیے جاتے ہیں اور ان کے بغیر اردو نثر کے ارتقا کا مطالعہ ادھورا رہ جاتا ہے، اتر پردیش اردو اکادمی نے ہمیشہ کوشش کی کہ نصابی کتابیں صحیح متن کے ساتھ لاگت سے کم قیمت پر فراہم کی جائیں۔ خطوط غالب کا زیر نظر انتخاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس انتخاب میں غالب کے نمائندہ خطوط شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان کے خطوط کا تنوع بھی نگاہ کے سامنے آجائے اور ان کے فکر و فن کی ہمہ جہتی بھی۔

انتخاب خطوط غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا، اب اس کا دوسرا ایڈیشن نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔

محمود الٰہی

چیرمین مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی

لکھنؤ

فہرست

میر مہدی مجروح کے نام

واہ واہ! سیّد صاحب! تُم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دِن سے تُمھارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں، مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بہ سبب ابر کے وہ سردی نہیں، تو میَں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے، مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کرُوں، جو سُخن پردازی کرُوں۔ بھائی! تُم تو اُردُو کے مرزا قتیلؔ بن گئے ہو، اُردُو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رُودِ نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیلؔ، کیا رُودِ نیل، یہ سب ہنسی کی باتیں ہیَں۔ لو، سُنو! اب تمھاری دِلّی کی باتیں ہیَں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے، حوض کے پاس جو کنُواں تھا اُس میں سنگ و خِشت ڈال کر بند کر دیا، بلّی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دُکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حُکم خاص و عام کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے علی بیگ، جے پوری کی زَوجہ، اِن سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہوگئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عبّاس شاہ، زینت محل کلکتے پہنچے اوَر وہاں سے جہاز سے چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از رُوئے قیاس، جیَسا کہ دِلّی کے خبر تراشوں کا دستوُر ہے، یہ بات اُڑا دی ہے، سو سارے شہر میں مشہوُر ہے کہ جنوری، شروعِ سال، سنہ ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اوَر پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر روپیے دیے جائیں گے۔

خیر، آج بُدھ کا دن، ۲۲ر دسمبر کی ہے۔ اب شنبے کو "بڑا دن" اوَر اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دِن ہے۔ اگر جیتے ہیَں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہُوا؟ تُم اِس خط کا جواب

لکھو اور شتاب لکھو۔

میری جان، سرفراز حسین! تم کیا کر رہے ہو اور کس خیال میں ہو؟ اب صورت کیا ہے اور آئندہ عزیمت کیا ہے؟

میر اشرف علی صاحب! آپ تو دائر سائر تھے۔ پانی پت میں کیوں کر مقیم ہو گئے؟ کچھ لکھیے تو میں جانوں۔

میر نصیر الدین کو صرف دعا اور اشتیاقِ دیدار۔

میرن صاحب کہاں ہیں؟ کوئی جائے اور بلا لائے۔ "حضرت" آئے۔ سلام علیکم، مزاجِ مبارک؟ کہیے مولوی مظہر علی نے آپ کے خط کا جواب بھیجا یا نہیں؟ اگر بھیجا، تو کیا لکھا؟ میں جانتا ہوں کہ میر اشرف علی صاحب اور میر سرفراز حسین کم، اور یہ ستم پیشہ میر مہدی بہت آپ کی جناب میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ کیا کروں؟ میں کہیں، تم کہیں۔ وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ کیوں کر تم سے بے ادبیاں کر سکتے۔ اِن شاءَ اللہ تعالیٰ، جب ایک جا ہوں گے تو انتقام لیا جائے گا۔ ہے ہے! کیوں کر ایک جا ہوں گے۔ دیکھیے زمانہ اور کیا دکھائے گا؟ اللہ! اللہ! اللہ!

(بدھ، ۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء)

(۲)

سید صاحب! نہ تم مجرم، نہ میں گناہ گار؛ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں، بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے؛ سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہاں گیر آباد کی زمین داری اور دلّی کی اِملاک اور پنشن کے بارے میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بمجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا، اُن کو دیکھا، چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں

اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتے کو گیا اور منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے، مجھ کو آئے ہوئے نواں دِن ہے۔ اِنتظار میں تھا کہ تمھارا خط آئے، تو اُس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح تمھارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں۔

روز اِس شہر میں اِک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شِدّت ہے، اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیا جرمانہ لیا جاتا ہے، آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اِس سے عِلاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو؛ کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے؟ تھانوں میں نقشے مرتّب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا؛ بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عِبارت الگ لکھ۔ عِبارت یہ ہے کہ "اسدُاللہ خاں پنسن دار سنہ ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کی بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نِکلا اور نہ نِکالا گیا۔ کرنیل برن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اُس کی اِقامت کا مدار ہے، اب تک کِسی حاکِم نے وہ حکم نہیں بدلا، اب حاکِم وقت کو اِختیار ہے۔" پرسوں یہ عبارت جماعہ دار نے محلّے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نِکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان، دُکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھادو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سُنادو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مُسلمان شہر میں اِقامت چاہے، بہ قدرِ مقدور نذرانہ دے۔ اُس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیا دے، اور ٹکٹ لے: گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے، دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اِخراج کیے جاتے ہیں، یا جو باہر پڑے ہوئے

ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ وَ الْحُکْمُ لِلّٰہِ۔

نورِ چشم میر سرفراز حسین اَور برخوردار میر نصیرُالدّین کو دُعا، اَور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اَور دُعا بھی۔ اِس میں سے وہ جو چاہیں، قبول کریں۔

(بدھ، ۲؍ فروری ۱۸۵۹ء)

(۳)

میر مہدی! جیتے رہو۔

آفریں صد ہزار آفریں! اُردوِ عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مُجھ کو رشک آنے لگا۔ سُنو! دِلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب کے احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دَولت تھی، سو ایک ظالم، پانی پت، انصاریوں کے محلّے میں رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر مَیں نے اُس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے!

میرے پنسن اَور ولایت کے انعام کا حال، کما ہو حقہٗ سمجھ لو۔ وَ لِلرَّحمٰنِ اَلطافٌ خَفِیّہٌ ایک طرزِ خاص پر تحریک ہوئی۔ سررِشتہ کی پابندی ضرور ہے۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکمِ پنجاب کو لِکھا کہ حاکمِ دہلی سے فلاں شخص کے پِنسن کے کُل چڑھے ہوئے رُوپیے کے یک مُشت پانے کی اَور آئندہ ماہ بہ ماہ روپیا ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم حُکمِ منظوری دے کر تُمھارے پاس بھیج دیں۔ سو اُس کی تعمیل فوراً بہ طرزِ مُناسِب ہو گئی۔ کم و بیش دو مہینے میں رُوپیا سب مل جائے گا؛ اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو ضرورت ہو تو سو رُوپیا خزانے سے منگوا لو۔ مَیں نے کہا، صاحب! یہ کیسی بات ہے کہ اَوروں کو برس دِن کا رُوپیا مِلا اَور مُجھے سَو رُوپے دِلواتے ہو؟ فرمایا کہ تُم کو اب چند دِن میں سب روپیا اَور اِجرا کا حُکم مل جائے گا، اَوروں کو برسوں میں یہ بات شاید میسّر آئے گی۔ مَیں چُپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپیے منگا لوں۔ پر، یار! وِلایت کے

انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ اس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکمِ دہلی اور حاکمِ پنجاب اپنی کیا رائے لکھتے ہیں۔ حاکمِ پنجاب کو گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟ چنانچہ حاکمِ دہلی نے ایک کتاب مجھ سے بھی لے کر مانگی اور میں نے دے دی۔ اب دیکھو حاکمِ پنجاب کیا لکھتا ہے؟

اِس وقت تمھارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا، تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانہ کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔ میر سرفراز حسین، میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعا۔

دوشنبہ۔ ہفتم مارچ ۱۸۵۹ء

(۴)

بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں! دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی؛ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازارِ جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلا پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو، دلی کہاں؛ ہاں کوئی شہر قلمروِ ہند میں اِس نام کا تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ر دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے، کہاں اترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں؟ آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے کہ اُن کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڈھ، بلب گڈھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض، تین جو باقی رہے۔ اُس میں سے دوجانہ و لوہارو، تحتِ حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس، بس۔ رہے دربارِ عام والے مہاجن لوگ: سب موجود۔ اہلِ اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں؛ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں

مولوی صدرالدین، بلّی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ "اسد"۔ تینوں مردود، مطرود، محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

تم آتے ہو، چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان کا نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔

"مجتہد العصر" میر سرفراز حسین کو دعا۔ "حکیم الملک" حکیم اشرف علی کو دعا۔ "قطب الملک" میر نصیر الدین کو دعا۔ "یوسفِ ہند" میر افضل علی کو دعا۔

مرقومۂ صبحِ جمعہ۔ ۶ر جمادی الاوّل، ۲ر دسمبر سال حال (۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء)

(۵)

بے مے نہ کند در کفِ من خامہ روائی
سرد است ہوا، آتشِ بے دود! کجائی؟

میر مہدی! صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر ہائے! وہ آتشِ سیّال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے، فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی، دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔ ساقیِ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب! ہائے غضب! ہائے غضب!

میاں تم پنسن پنسن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں اور پنسن کہاں؟ صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر، نواب لفٹنٹ گورنر بہادر، جب ان تینوں نے جواب دیا ہو، تو اس کا مرافعہ گورمنٹ میں کروں۔ مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنسن

کا ذکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اُس کا اپیل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے ہاں کیا ہے۔

دیکھیے کیا جواب آتا ہے

بہر حال جو کچھ ہوگا، تم کو لکھا جائے گا۔

اجی وہ "یوسف ہند" نہ سہی، "یوسف دہر" سہی، "یوسف عصر" سہی "یوسف ہفت کشور" سہی۔ اُن کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔ مجھے تو خبر نہیں، کہیں عضرت کہہ گئے ہیں کہ میں ساڑھے سات روپیا مہینا بھیجے جاؤں گا۔ اب اُس کا تقاضا ہے۔ رحیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ چچا جان کو لکھو کہ پھوپھی جان بھوکی مرتی ہیں، خرچ جلد بھیجو۔ ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔ بہر حال یوسف صاحب کو یہ عبارت پڑھوا دینا۔

میر سرفراز حسین کو دعا، میر نصیر الدین کو دعا، حکیم میر اشرف علی کو دعا۔ "یوسف ہفت کشور" کو دعا۔

سہ شنبہ، ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۶)

اہاہا! میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی! مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو۔ یہ رام پور ہے، دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے، اور کوسی اُس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اُس میں ملی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی! آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے، لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا؟

تمھارا خط پہنچا۔ تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے۔ نہ محرف لکھنے کی حاجت، نہ محلے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجیے اور جواب

لیا کیجیے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے، اور صحبت مرغوب ہے۔ اِس وقت تک مہمان ہوں، دیکھوں کیا ہوتا ہے؟ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ اِس وقت اِس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔

فروری ۱۸۶۰ء

(۷)

میر مہدی! تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہِ مبارکِ رمضان میں کبھی مسجدِ جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اِس مہینے میں رام پور کیوں کر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی! میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یک شنبے کو غرۂ ماہِ مقدس ہُوا۔ اُسی دِن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں۔ شب کو مسجدِ جامع جا کر نمازِ تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم "مہتاب باغ" میں جا کر روزہ کھولتا ہوں۔ اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ وا! کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔

اب اصل حقیقت سنو؛ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا، وہاں اُنھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے! اگر کوئی امر حادث ہو، تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اِس سبب سے جلد چلا آیا، ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرطِ حیات جریدہ بعدِ برسات جاؤں گا اور بہت دِنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔

قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سَو روپیا مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا، تو سَو روپے مہینا بہ نامِ دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سَو روپیا مہینا پاؤں، اور دلّی رہوں تو سَو روپے۔ بھائی سَو دو سَو میں کلام نہیں، کلام اِس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں،

مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ مُلاقات بھی دوستانہ رہی۔ مُعانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صوٗرت مُلاقات کی ہے۔ لڑکوں سے مَیں نے نذر دِلوائی تھی، بس۔ بہر حال غنیمت ہے۔ رِزق اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار رُپیے سال ٹھہرے۔ اُس میں سے مجُھ کو ملے ساڑھے سات سو رُپیے سال۔ ایک صاحب نے نہ دیے، مگر تین ہزار روپیے سال۔ عزّت میں وہ پایہ جو رُیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے بنا رہا۔ "خان صاحب بسیار مہربانِ دوستان" القاب، خلعت سات پارچہ اوَر جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظِر، حکیم کِسی سے توقیر کم نہیں، مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو، میری جان! یہاں بھی وہی نقشا ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہُوں، ٹٹّی لگی ہوئی ہے، ہوا آ رہی ہے، پانی کا جھجّر دھرا ہُوا ہے۔ حُقّہ پی رہا ہُوں، یہ خط لکھ رہا ہُوں۔ تُم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کریں۔

میر سرفراز حُسین اوَر میرن صاحب اوَر میر نصیر الدّین کو یہ خط پڑھا دینا اور میری دُعا کہہ دینا۔

جمعہ، ۶ر اپریل ۱۸۶۰ء۔

(۸)

بھائی! تُم سچ کہتے ہو:

بر سرِ اوَلادِ آدم ہر چہ آید، بگذرد

لیکن مجُھے افسوس اِس بات کا ہے کہ یہ زیر باری میری تحریر کے بھروسے پر ہوئی اوَر خلاف میری مرضی کے ہوئی۔ جِس طرح سے یہ آئے ہیں، اگرچہ میری طبیعت اوَر میری خواہش کے منافی ہے، لیکن واللہ! میرے عقیدے اوَر تصوّر اوَر قیاس کے مُطابِق ہے۔ یعنی میں یہی سمجھا تھا کہ البتّہ یوں ہی ہوگا۔

"دیوانِ اُردوٗ" چھپ چُکا ہے۔ ہائے! لکھنوٗ کے چھاپا خانے نے جس کا دیوان چھاپا،

اُس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دِلّی پر اور اُس کے پانی پر اور اُس کے چھاپے پر لعنت! صاحبِ دیوان کو اِس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتّے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، مُتوسّط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چُکے۔ حقّ التصنیف ایک مُجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظِ غلط جوں کے توں ہیں، یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا، وہ چھپا۔ بہر حال، خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اِسی ہفتے میں تین مجلد اصحابِ ثلاثہ کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہُوا ہوں، نہ تُم خوش ہوگے۔ اور یہ جو لکھتے ہو کہ یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو۔ میں دلاّل نہیں، سوداگر نہیں، مُہتمم مطبع نہیں۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حُسین خاں، مہتمم مرزا امو جان، مطبع شاہدرے میں، محمد حُسین خاں۔ دِلی شہر، رائے مان کے کوچے میں، مُصوّروں کی حویلی کے پاس۔ قیمت کتاب "۶ آنے" محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔ طالبانِ کتاب کو اطلاع دو۔ دو چار، دس، پانچ جلدیں جس کو منگانی ہوں، محمد حُسین خاں کے نام پر دِلی رائے مان کے کوچے، مُصوّروں کی حویلی کا پتا لکھ کر، خط ڈاک میں بھجوا دو، کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔ قیمت چاہو نقد، چاہو ٹکٹ ارسال کرو۔ مُجھ کو کیا اور تُم کو کیا۔ جو کہے اُس کو یہ جواب دو۔

وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی عورت، اِن دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی۔ تُف بریں وبا!

پنج شنبہ، ۸ ماہ اگست کی، آخری مہینے کا حال کچھ معلوم نہیں۔ کل شام کو دو دو مونڈھے رکھ کر کئی آدمی دیکھا کیے، ہلال نظر نہیں آیا۔

پنج شنبہ، ۸ اگست ۱۸۶۱ء۔

نجات کا طالب

غالب

ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ "مجتہدالعصر" کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔
اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا
دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو پڑا کرو، مسودے کے کاغذ کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟
یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ "یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے
خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔
برخوردار میر سرفراز حسین کو دعا دینا اور دعا کہنا۔ اور ہاں، حکیم میر اشرف علی اور میر افضل
علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو" کیوں؟ سچ
کہیو، اگلوں کے خطوں کی تحریر یہی طرز تھی یا اور؟ ہائے! کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک
یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے، چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے میوہ ہے،
خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو، تم جانتے ہو کہ ہم
زندہ ہیں، امر ضروری کو لکھ لیا، زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا، اور اگر تمہاری
خوشنودی اسی طرح کی طرز نگارش پر منحصر ہے، تو بھائی! ساڑھے تین سطریں ویسی بھی ہم
نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر! ہم نے بھی وہ عبارت
جو مسودے کے ساتھ لکھی تھی، اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو۔ خفا نہ ہو۔

میر نصیر الدین ایک بار آئے تھے، پھر نہ آئے۔ نثر فارسی نئی میں نے کہاں لکھی کہ
تمہارے چچا کو یا تم کو بھیج دوں۔ نواب فیض محمد خاں کے بھائی حسن علی خاں مر گئے۔
حامد علی خاں کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی۔ کلو داروغہ
بیمار ہو گیا تھا، آج اس نے غسل صحت کیا۔ باقر علی خاں کو مہینا بھر سے تپ آتی ہے۔
حسین علی خاں کے گلے میں دو غدود ہو گئے ہیں۔ شہر چپ چاپ، نہ کہیں بھاوڑا
بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے، نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ

بنتا ہے۔ دِلّی شہرِ خموشاں ہے۔
کاغذ نبڑ گیا، ورنہ تمھارے دِل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔
یک شنبہ ۲۲ ستمبر (۱۸۶۱ء)

(۱۰)

جانِ غالب! تمھارا خط پہنچا، غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے؛
ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہیں؟
مصرع بدل دینے سے وہ شعر کس رُتبے کا ہوگیا! اے میر مہدی! تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی؛
میاں! یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے
ارے، اب اہلِ دِلی یا ہندو ہیں، یا اہلِ حرفہ ہیں، یا خاکی ہیں، یا پنجابی ہیں، یا گورے ہیں۔ اِن میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔
خس کی ٹٹّی، پُروا ہوا اب کہاں؟ وہ لُطف تو اُسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال می گزرد۔ مُصیبتِ عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈِگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ خیر، کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہوکر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجدِ جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجدِ جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بلامُبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہوجائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اُس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کُھلے رہے، باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تُم دیکھ گئے ہو۔ اب

آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرا دھوبی واڑا، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ حویلی، اِن میں سے کسی کا پتا نہیں مِلتا۔ قِصّہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا، تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

اللہ اللہ! دِلّی نہ رہی اور دِلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حُسنِ اعتقاد! ارے بندۂ خُدا! اُردوٗ بازار نہ رہا، اردوٗ کہاں؟ دِلّی، واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔

الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الکزنڈر ہڈرلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا اُن کی مُصاحبت نہیں، ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔

میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدّین کو دُعا۔

(۱۸۶۱ء)

(۱۱)

آئیے جناب میر مہدی صاحب دہلوی! بہُت دنوں میں آئے، کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے؟ میر سرفراز حُسین صاحب اچھّی طرح ہیں؟ میرن صاحب خوش ہیں؟

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مِٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے؟ قد اُس کا کِتنا لمبا ہے؟ ہاتھ پانوْ کیسے ہیں؟ رنگ کیسا ہے؟ جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جِسم و جسمانیات میں سے نہیں۔ ایک اعتبارِ محض ہے۔ وجود اُس کا صِرف تعقّل میں ہے۔ سیمُرغ کا سا اُس کا وجود ہے۔ یعنی کہنے کو

ہے، دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے، تو گویا اُس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے۔

می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا

دیدن حبیب را و نہ دیدن رقیب را

لف و نشر مُرتّب ہے۔ می خواہم از خُدا دیدن حبیب را، نمی خواہم از خدا دیدن رقیب را۔ خوار وزار و خستہ و سوگوار، معنی تو اِس میں موجود ہیں، مگر بول چال ٹکسال باہر ہے۔ ایک جُملے کا جُملہ مُقدّر چھوڑ دیا ہے، اور پھر اِس بھونڈی طرح سے کہ جِس کو "المعنی فی بطن الشّاعر" کہتے ہیں۔ یہ شعر اساتذۂ مُسلّم الثّبوت میں سے کِسی کا نہیں ہے۔ کوئی صاحب ہوں گے کہ اُنھوں نے لوگوں کو حیران کرنے کے واسطے یہ شعر کہہ دیا اور کِسی اُستاد کا نام لے دیا کہ یہ اُن کا ہے۔

تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ مُنضبط نہیں کہ جِس پر حُکم کیا جائے۔ جو جِس کے کانوں کو لگے، جِس کو جِس کا دِل قبول کرے، اُس طرح کہے۔ "رتھ" میرے نزدیک مُذکّر ہے۔ یعنی رتھ آیا، لیکن جمع میں کیا کروں گا؟ ناچار مؤنّث بولنا پڑے گا۔ یعنی "رتھیں آئیں"۔ خبر مُونّث ہے بہ اتّفاق، مگر "کاغذِ اخبار" اِس کو خود سمجھ لو کہ تُمھارا دِل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مُذکّر کہوں گا، یعنی "اخبار آیا"۔ "پیر ہوئی یا ہوا؟" یہ منطق عوام کا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ "دوشنبہ ہوا" "پیر کا دِن ہوا" نری "پیر ہوئی" یا "پیر ہوا" ہم کیوں بولیں گے؟ "بُلبُل" میرے نزدیک مونّث ہے، جمع اِس کی "بُلبُلیں"۔ طوطی بولتا ہے، بُلبُل بولتی ہے۔

بھائی! اِس امر میں مُفتی و مُجتہد بن نہیں سکتا، اپنا عِندیہ لِکھتا ہوں۔ جو چاہے مانے، جو چاہے نہ مانے۔

سہ شنبہ، ۸ دسمبر ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب

غالب

اے جناب میرن صاحب! السّلامُ علیکُم "

حضرت آداب "

"کہو صاحب! آج اِجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لِکھنے کو؟"

"حُضور! میں کیا منع کیا کرتا ہوں، میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بُخار جاتا رہا ہے، صِرف پیچش باقی ہے، وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دُعا لِکھ دیتا ہوں، آپ پھر کیوں تکلیف کریں؟"

"نہیں میرن صاحب! اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دِن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہُوا ہوگا۔ جواب لِکھنا ضرور ہے"

"حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیوں ہوں گے؟"

"بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تُم مُجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟"

"سُبحان اللہ! اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لِکھتے، اور مُجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے"

"اچھّا تم باز نہیں رکھتے، مگر یہ تو کہو کہ تُم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لِکھوں؟"

"کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سُنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے۔ میں اب پنج شنبے کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دِن کے بعد آپ خط شوق سے لِکھیے گا"

"میاں بیٹھو۔ ہوش کی خبر لو۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مُجھ کو کیا عِلاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، بھولا آدمی، تمھاری باتوں میں آگیا۔ اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔

سُنو میر مہدی صاحب! میرا کُچھ گُناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لِکھو۔ تپ تو رفع

ہوگئی، پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کھانے کو کچھ ملتا ہی نہیں۔ تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو، عصمتِ بی بی از بے چادری' ہوگا۔ حالات یہاں کے مفصّل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔

دیکھو، بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں، حکیم میر اشرف علی میں اور اِن میں کچھ کونسل ہو تو ہی ہے۔ پنج شنبہ روانگی کا دِن ٹھہرا تو ہے۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں، تو ان سے یہ پوچھیو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سال گرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی؟ اور یہ بھی معلوم کر لیجیو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اِس کے معنی کیا ہیں؟ پوچھیو اور نہ چھوڑیو، جب تک نہ بتائیں۔

اِس وقت پہلے تو آندھی چلی، پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں، سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا۔ جب ترشّح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا۔

میر سرفراز حسین کو دُعا پہنچے۔ اللہ اللہ! تم پانی پت کے "سلطانُ العُلما" اور "مجتہدُ العصر" بن گئے۔ کہو، وہاں کے لوگ تمھیں "قبلہ و کعبہ" کہنے لگے یا نہیں؟ میر نصیرالدین کو دُعا کہنا۔

(مئی ۱۸۶۱ء)

(۱۳)

میاں! کس حال میں ہو، کس خیال میں ہو؟ کل شام کو میرن صاحب روانہ ہوئے یہاں اُن کی سسرال میں قصّے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوش دامن صاحب بلائیں لیتی ہیں، سالیاں کھڑی ہوئی دُعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانندِ صورتِ دیوار چُپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو، مگر ناچار چُپ، وہ تو غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان، ورنہ ہمسائے میں قیامت برپا

ہوجاتی، ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ اِمام ضامن علیہ السّلام کا رُوپیا بازُو پر باندھا گیا۔ گیارہ رُوپیے خرچ راہ دِیے، مگر ایسا جانتا ہُوں کہ میرن صاحب اپنے جدّ کی نیاز کا رُوپیا راہ ہی میں اپنے بازُو پر سے کھول لیں گے اور تُم سے صرف پانچ رُوپیے ظاہِر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تُم پر کُھل جائے گا۔ دیکھنا، یہی ہوگا کہ میرن صاحب تُم سے بات چھپائیں گے۔ اِس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے، اور وہ محلِّ غور ہے۔ ساس غریب نے بہت سی جلیبیاں اور تودۂ قلاقند ساتھ کر دیا ہے، اور میرن صاحب نے اپنے جی میں اِرادہ کر لیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے، اور قلاقند تمھاری نذر کر کر تُم پر اِحسان دھریں گے۔ "بھائی! میں دِلّی سے آیا ہُوں، قلاقند تُمھارے واسطے لایا ہُوں"۔ زِنہار زِنہار باور کیجیو۔ مالِ مُفت سمجھ کر لے لیجیو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلّو، ایاز کے سر پر قُرآن رکھو، کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو۔ بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہُوں کہ اِن تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔ واللہ! میرن صاحب نے کِسی سے نہیں منگایا۔ اور سُنو۔ مولوی مظہر علی صاحب لاہوری دروازے کے باہر صدر بازار تک اُن کو پہنچانے کو گئے۔ رسمِ مُتابعت عمل میں آئی۔ اب کہو بھائی! کون بُرا اور کون اچھا ہے۔ میرن صاحب کی نازک مزاجیوں نے کھیل بِگاڑ رکھا ہے، یہ لوگ تو اُن پر اپنی جان نثار کرتے ہیں، عورتیں صدقے جاتی ہیں، مرد پیار کرتے ہیں۔

"مُجتہدُ العصر، سُلطانُ العُلما" مولانا سرفراز حُسین کو میری دُعا کہنا، اور کہنا کہ حضرت ہم تُم کو دُعا کہیں اور تُم ہم کو دُعا دو۔ میاں! کِس قصّے میں پھنسا ہے؟ فِقہ پڑھ کر کیا کرے گا؟ طِب و نجُوم و ہیئت و منطق و فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہے۔

خُدا کے بعد نبی، اور نبی کے بعد اِمام

یہی ہے مذہبِ حق، والسّلام و الاِکرام۔

"علی علی" کیا کرو اور فارغُ البال رہا کرو۔

مئی (۱۸۶۱ء)

برخوردارِ کامگار میر مہدی!

قطعہ تُم نے دیکھا؟ سچ مچ میرا حُلیہ ہے۔ واہ! اب کیا شاعری رہ گئی ہے۔ جس وقت میں نے یہ قطعہ وہاں کے بھیجنے کے واسطے لکھا، ارادہ تھا کہ خط بھی لکھوں، لڑکوں نے ستایا کہ دادا جان چلو، کھانا تیار ہے، ہمیں بھوک لگی ہے۔ تین خط اور لکھے ہوئے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیوں لکھوں؟ اِسی کاغذ کو لفافے میں رکھ کر، ٹکٹ لگا، سرنامہ لکھ، کلیان کے حوالے کر، گھر میں چلا گیا اور ہاں، ایک چھیڑ بھی تھی کہ دیکھوں میرا میر مہدی خفا ہو کر کیا باتیں بناتا ہے۔ سو وہی ہُوا۔ تُم نے جلے پھپھولے پھوڑے۔ لو اب بتاؤ، خط لکھنے بیٹھا ہوں، کیا لکھوں؟ یہاں کا حال زبانی میرن صاحب کی سُن لیا ہوگا۔ مگر وہ جو کچھ تُم نے سُنا ہوگا، بے اصل باتیں ہیں۔ پنسن کا مُقدمہ کلکتے میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیشِ نظر، یہاں کے حاکم نے اگر ایک رُوبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی، میرا اُس میں کیا ضرر؟

یہاں تک لکھ چُکا تھا کہ دو ایک آدمی آ گئے۔ دِن بھی تھوڑا رہ گیا۔ میں نے بکس بند کیا۔ باہر تختوں پر آ بیٹھا۔ شام ہوئی، چراغ روشن ہُوا۔ منشی سیّد احمد حُسین سرھانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہُوا ہوں، کہ ناگاہ چشم و چراغِ دُودمانِ عِلم و یقین سیّد نصیر الدّین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں، اور ایک آدمی ساتھ، اُس کے سر پر ایک ٹوکرا، اُس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا: اہاہاہا! سُلطان العُلما مولانا سرفراز حُسین دہلوی نے دوبارہ رسد بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہُوا کہ وہ نہیں ہے، یہ کچھ اور ہے فَیضِ خاص نہیں، لُطف عام ہے۔ شراب نہیں، آم ہے۔ خیر، یہ عطیہ بھی بے خلل ہے، بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو ایک ایک سربہ مُہر گلاس سمجھا لکورے سے بھرا ہُوا، مگر واہ! کِس حکمت سے بھرا ہے کہ پینسٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا

ہے۔ میاں کہتا تھا کہ یہ اسی سے، پندرہ بڑے لئے، بلکہ سڑے لئے۔ تا ان کی برائی اور دل میں سرا نہ کرے، ٹوکرے میں سے پھینک دیے۔ میں نے کہا: بھائی صاحب کم ہے؟ مگر میں تمھاری تکلیف اور تکلّف سے خوش نہیں ہُوا۔ تمھارے پاس رُوپیا کہاں، جو تم نے آم خریدے؟ خانہ آباد، دَولت زیادہ۔

لکور کے معنی تم نہ سمجھے ہوگے۔ ایک انگریزی شراب ہوتی ہے۔ قِوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب، اور طعم کی ایسی میٹھی جیسا قند کا قوام پتلا۔ دیکھو، اِس لُغت کے معنی کسی فرہنگ میں نہ پاؤ گے، ہاں فرہنگِ سروری میں ہوں تو ہوں۔

"مُجتہدُ العصر" اور حکیم میر اشرف علی کو، کہ وہ اُن کے عِلم کی کُنجی ہیں، اور ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس پچاس رُوپے کو لے گئے ہیں، میری دُعا کہ دینا۔

چہار شنبہ ششم جولائی ۱۸۵۹ء۔

(۱۵)

آؤ میاں سیّد زادۂ آزادہ، دِلّی کے عاشقِ دل دادہ، ڈھئے ہوئے "اُردُو بازار" کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔

نِظام الدّین ممنونؔ کہاں! ذوقؔ کہاں! مومنؔ خاں کہاں! ایک آزُردہؔ، سو خاموش، دوسرا غالبؔ، وہ بیخود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سُخن دانی، کس برتے پر تتّا پانی؟

ہائے دِلّی! وائے دِلّی! بھاڑ میں جائے دِلّی!

سنو صاحب! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حُسین خاں ولد سردار خاں ولد دِلاور خاں، اور نانا اس احمد حُسین خاں کے غُلام حُسین خاں ولد مُصاحِب خاں۔ اِس شخص کا حال ازرُوئے تحقیق مُشرّح اور مُفصّل لکھو۔ قوم کیا ہے؟ عُمر کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ احمد حُسین کی لیاقتِ ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی! خوب پہچان کر لکھو اور جلد لکھو۔

پنج شنبہ، ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء

ہرگوپال تفتہ کے نام

صاحب! تم جانتے ہو یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت پیش آئے، شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اُسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے اور تمھارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اِس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اُس کا جواب مجھ کو آیا، اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اِس کا نام بھی دلّی اور اِس محلّے کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں نہیں پایا جاتا۔ واللہ! ڈھونڈنے کو مسلمان اِس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہندو البتّہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا؟ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا، بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے، اور وہ نوکر ہیں راجا نریندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبانِ عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بر وقتِ غارتِ دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چناں چہ بعدِ فتح راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصّل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔

ملازمانِ قلعہ پر شِدت ہے ، اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں ؛ مگر وہ نوکر جو اِس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اِصلاح دینے پر متعلق ہُوا ہوں۔ خواہی اِس کو نوکری سمجھو ، خواہی مزدوری جانو۔ اِس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دِیا ، صِرف اشعار کی خِدمت بجالاتا رہا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حُکّام کو معلوم ہے ، مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مُخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی ، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بُلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں ، میری کیا حقیقت تھی ؟ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا ، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے ، شہر میں ہے کون جو آوے ؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مُجرِم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بہ دستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں۔ بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حُکّام کی توجّہ بھی نہیں۔ دیکھیے ! انجام کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زِنہار یہاں کا اِرادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے ، مُسلمانوں کی آبادی کا حُکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہر حال ، مُنشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اِس وقت تُمھارا خط پہنچا اور اِسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دِیا۔

(شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

(۲)

کیوں صاحب ! مجھ سے کیوں خفا ہو ؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہوگا ، یا بعد دو چار دِن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ اِنصاف کرو ، کِتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا

کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیوجی رام برہمن اور بال مکند اُس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اِس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرّخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ وہ آمد خطوط کی مَوقوف۔ صِرف تم تین صاحبوں کی آمد کی توقّع۔ اُس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں، ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مِہربانی کرتے ہو۔ سُنو صاحب! اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا، دو خط، تین خط، ورنہ صِرف خَیر و عافیت لِکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔

بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دِن ہوئے کہ آیا تھا، اُس کا جواب بھیج دیا گیا۔ مولوی قمرالدّین خاں، یقین ہے کہ الٰہ آباد گئے ہوں گے۔ کِس واسطے کہ مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائلِ جون میں جاؤں گا۔ بہرحال اگر آپ آزُردہ نہیں، تو جِس دِن میرا خط پہنچے، اُس کے دوسرے دِن اُس کا جواب لکھیے۔ اپنی خَیر و عافیت، مُنشی صاحب کی خَیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال، اِس سے سوا گوالیار کے فِتنہ و فساد کا ماجرا، جو معلوم ہوا ہو، وہ الفاظِ مُناسِب وقت میں ضرور لکھنا۔ راجا جو وہاں آیا ہوا ہے اُس کی حقیقت۔ دھول پور کا رنگ۔ صاحبانِ عالی شان کا اِرادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے؟ وہاں کے لوگ خائِف ہیں یا نہیں؟۔

نگاشتہ شنبہ، ۱۹ر جون ۱۸۵۸ء

(۳)

رکھیو غالبؔ مجھے اِس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مِرے دِل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور! پہلے تُم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوستِ قدیم میر مُکرّم حُسین صاحب کی

خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں، اور اِس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہرؔ کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھنا!

شرطِ ایمان بود در رَزِشِ ایماں بالغیب

اے تو غائب ز نظر، مہرِ تو ایمانِ من ست

تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اُس کے دو دِن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب! جِس شخص کو جِس شغل کا ذوق ہو اور وہ اُس میں بے تکلّف عُمر بسر کرے، اُس کا نام عَیش ہے۔ تمھاری توجّہ مُفرط بہ طرفِ شعر و سخن کے تمھاری شرافتِ نفس اور حُسنِ طبع کی دلیل ہے، اور بھائی یہ جو تمھاری سُخن گستری ہے، اُس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اِس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور لگے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں! اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مِصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دِل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالبؔ!

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مِصرع پڑھ کر چُپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا اِنتظار ہے؟

یہ کوئی نہ سمجھے کہ مَیں اپنی بے رَونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دُکھ مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم! مگر اُس بیان کی طرف اِشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اُس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا، اور کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست، اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مِل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کِتنا سخت ہوتا ہے، جو اِتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیوں کر نہ دشوار

ہو! ہائے! اِتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

جون جولائی ۱۸۵۸ء

(۴)

کیوں صاحب! رُوٹھے ہی رہوگے یا کبھی منوگے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے، تو رُوٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اِس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا، تو میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خُدا کا احسان ہے کہ کوئی دِن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف وجوانِب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دِن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صُبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دِل لگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب، دس دس بارہ بارہ دِن سے تُمھارا خط نہیں آیا؟ یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب! نہ لکھنے کی وجہ لکھو؛ آدھ آنے میں بُخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار، ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء

غالبؔ

(۵)

میری جان! کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہؔ و غالبؔ کیوں کر بن جائیں؟ ہر کسے را بہرِ کارے ساختند۔ انت متا، سومتا۔ مِصری میٹھی، نمک سلونا۔ کبھی کسی شے کا مزا نہ بدلے گا۔ اب جو میں اُس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھے گا کہ غالبؔ کیا جانے کہ عبدُالرحمٰن کون ہے؟ اور مجھ سے اُس سے کیا رسم و راہ ہے؟ بے شُبہ جانے گا کہ تفتہؔ نے لکھا ہوگا۔ میں اُس کی نظر میں سُبک ہو جاؤں گا اور تم سے وہ اور بھی سرگراں ہو جائے گا، اور یہ جو تُم لکھتے ہو کہ تو نے اُس شخص کو عزیزوں میں گنا ہے، بندہ پرور! میں

نو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیز داری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے؛ اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو، تو مجھ کو اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں۔ از راہِ حسنِ اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہ دیا، تو کیا ہوتا ہے؟ زین العابدین خاں عارف، میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اس کی سالی کا بیٹا، اس کو جوچا ہو سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب ادھر سے آدمیت نہ ہوئی، تو اب اس کو لکھنا لغو، بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔

تمھارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفےٰ خاں سے ملنا ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں، اب تمھارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندر آباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالےٰ شانہٗ، تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومۂ جمعہ، ۲۳ر دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء

(۶)

میرزا تفتہ! جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ! تم سے اور آزردگی۔ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوستِ صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا "ہرگوپال" نام اور "تفتہ" تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجبِ ملال ہو۔ رہا غمّاز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا، کہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری برائی کہتا، تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔

بھائی! مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی، لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہو گئی، خاطر میری جمع ہے کہ اب اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔

اِس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں، بہ کار آمدنی نہیں۔ خیر، کبھی دیکھ لوں گا، جلدی کیا ہے؟ تین باتیں جمع ہوئیں: میری کاہلی، تمھارے کلام کا مُحتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصوّر نہ ہونا۔ نظر اِن مراتب پر کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بال مکند بے صبر کا ایک پارسل ہے کہ اُس کو بہت دِن ہوئے آج تک سرنامہ بھی نہ کھولا۔ نوّاب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضُعف نے غالِبؔ نکمّا کر دِیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔ آج اِس وقت کہ سورج بلند نہیں ہُوا، اس کو دیکھا، لِفافہ کیا، آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوا دِیا۔

غالبؔ

۲۷ر نومبر سنہ ۱۸۶۲ء

(۷)

لو صاحب!

کھچڑی کھائی، دِن بہلائے
کپڑے پھاٹے، گھر کو آئے

۸ر جنوری ماہ وسالِ حال دو شنبے کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہُوا۔ تمھارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہُوا رام پور میں مَیں نے پایا۔ جواب لِکھنے کی فُرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مُرادآباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دِن صدرُ الصُّدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ اُنھوں نے بیمارداری اَور غم خواری بہُت کی۔

کیوں ترکِ لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا جِس کو اُتار کر پھینکو گے! ترکِ لباس سے قیدِ ہستی نہ مِٹ جائے گی۔ بِغیر کھائے پیے گزارا نہ ہو گا۔ سختی و سُستی،

رنج و آرام کو ہموار کر دو ۔ جس طرح سے ہو، اُسی صورت سے، بہ ہر صورت گزرنے دو ۔

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ !
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جنوری ۱۸۶۶ء اس خط کی رسید طالب، غالبؔ

(۸)

لاحَولَ وَلَاقُوَّۃ ! کس ملعون نے بہ سببِ ذوقِ شعر، اشعار کی اِصلاح منظور رکھی ۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خُدا مجُھ سے بیزار ۔ میں نے تو بہ طریقِ قہرِ درویش بہ جانِ درویش لکھا تھا ۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے ۔

مرزا حاتم علی مہر کے نام

خود شکوہ دلیلِ رفعِ آزار بس است
آید بہ زباں ہر آں چہ از دل بردد

بندہ پرور!

فقیر شکوے سے برا نہیں مانتا، مگر شکوے کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے منھ نہ موڑے، اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجائش نہ چھوڑے۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو آپ کا فرخ آباد جانا معلوم ہو گیا تھا، اس واسطے آپ کو خط نہیں لکھا تھا۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس عرصے میں کئی خط بھجوائے اور وہ الٹے پھر آئے۔ آپ شکوہ کاہے کو کرتے ہیں؟ اپنا گناہ میرے ذمے دھرتے ہیں۔ نہ جاتے وقت لکھا کہ میں وہاں جاتا ہوں، نہ وہاں جا کر لکھا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ کل آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آج میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ کہیے، اپنے دعوے میں صادق ہوں یا نہیں؟ بس، دردمندوں کو زیادہ ستانا اچھا نہیں۔ مرزا تفتہ سے آپ فقط ان کے خط نہ لکھنے کے سبب سرگراں ہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ان دنوں میں کہاں ہیں؟ آج توکلت علی اللہ سکندرآباد خط بھیجتا ہوں، دیکھوں، کیا دیکھتا ہوں؟

(۵، مارچ ۱۸۵۸ء)

(۲)

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے؟ غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے؟
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے!

عِلاقۂ محبتِ ازلی کو برحق مان کر اور پیوندِ غلامیِ جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر

ایک بات اور کہتا ہوں کہ : بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے، مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اُس کے اجارے میں آئی ہے، یہ بھی دلیلِ آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید وادید نہ ہولے، اپنے کو بیگانۂ یک دیگر سمجھیں؟ البتّہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں۔ اگر سمجھیں، سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان ہے۔ خدا کرے وہ خط، جس میں میں نے آپ کو سلام لکھا تھا، آپ کی نظر سے گزر گیا ہو۔ احیاناً اگر نہ دیکھا ہو تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجیے گا، اور خط کے لکھنے کے احسان کو اِس خط کے پڑھ لینے سے دو بالا کیجیے گا۔

ہائے میجر جان جاکوب! کیا جوان مارا گیا۔ سچ، اُس کا یہ شیوہ تھا کہ اُردو کی فکر کو مانع آتا، اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ بندہ نواز! یہ بھی انھیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزارہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں؟ اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں، تو کوئی غم خوار نہیں، مروں، تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ، چشم بد دور! اُردو کی راہ کے تو سالک ہو، گویا اِس زبان کے مالک ہو۔ فارسی بھی خوبی میں کم نہیں، مشق شرط ہے۔ اگر کہے جاؤ گے، لطف پاؤ گے۔ میرا تو گویا بہ قولِ طالب آملی اب یہ حال ہے :

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی   دہن بر چہرہ زخمے بود، بہ شد

جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے خط مجھ کو لکھا ہو، تو کیوں کر مجھ کو اپنے خط کے جواب کی نہ تمنّا ہو؟ پہلے تو اپنا حال لکھیے، کہ میں نے سنا تھا آپ کہیں کے صدر امین ہیں، پھر آپ اکبرآباد میں کیوں خانہ نشین ہیں؟ اِس ہنگامے میں آپ کی صحبت حکّام سے کیسی رہی؟ راجا بلوان سنگھ کا بھی حال لکھنا ضرور ہے کہ کہاں ہیں اور وہ دو ہزار روپے مہینا جو اُن کو سرکار انگریزی سے ملتا تھا، اب بھی ملتا ہے یا نہیں؟

ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اُس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟ قبلہ و کعبہ حضرت

مجتہد العصر کی سرگزشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہوئی۔ اُمیدوار ہوں کہ جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ پتہ مسکنِ مبارک کا "کشمیری بازار" سے زیادہ نہیں معلوم ہُوا۔ ظاہرا اِسی قدر کافی ہوگا، ورنہ آپ زیادہ لکھتے۔ مرزا تفتہ کو دُعا کہیے گا، اور اُن کے اُس خط کے پہنچنے کی اِطّلاع دیجیے گا، جس میں آپ کے خط کی اُنھوں نے نوید لکھی تھی۔ والسلام۔

(اوائل جولائی ۱۸۵۸ء)

(۳)

مرزا صاحب!

میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مُراسلے کو مُکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اِتنا تو کہو، کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہوگئے کہ تمھارا خط نہیں آیا، نہ اپنی خیر و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاتھرس سے خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے اُن کو دے آیا ہوں، اور اُنھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دِن ہوئے جو تم نے مجھ کو خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طِلائی لوح مُرتّب ہوگئی ہے، پھر اب اِن دو کتابوں کی جِلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟ اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مُہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمھاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جِلدوں کے اسی ہفتے میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت اِرشاد کریں کہ یہ سات جِلدیں کب آئیں گی؟ ہرچند کاری گروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دِل کی پریشانی دور ہو۔ خُدا کرے اِن تینتیس جِلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جِلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں، تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے
مَیں نے جو کہا، اُنھوں نے لکھ لیا۔ اُن دونوں کے گھر لُٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب
خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر
کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔
اُس نے وہ کاغذ مجھ کو دِکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلے میں
اُس کے اِس خط کا جواب چاہتا ہوں۔

نومبر، ۱۸۵۸ء

(۴)

جنابِ مرزا صاحب! "دِلّی کا حال" تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا، جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا؟ وہ خبر محض غلط ہے، اگر کچھ ہے تو بدیں نمط ہے کہ
چند روز چند گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا، اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے بہ اتفاقِ رائے
ہمدگر ایسا بند وبست کیا کہ وہ فساد مِٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔
ناسخ مرحوم جو تمھارے اُستاد تھے، میرے بھی دوستِ صادقُ الوداد تھے، مگر یک فنّے
تھے۔ صرف غزل کہتے تھے، قصیدے اور مثنوی سے اُن کو کچھ علاقہ نہ تھا۔ سُبحان اللہ!
تُم نے قصیدے میں وہ رنگ دِکھایا، کہ اِنشا کو رشک آیا۔ مثنوی کے اشعار جو مَیں نے دیکھے،
کیا کہوں کیا حظ اُٹھایا!

خُدا سے مَیں بھی چاہوں از رہِ مہر
فروغِ میرزا حاتم علی مہر

اگر اِسی انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اُردو کہلائے گی۔ خدا تم کو جیتا رکھے،

Scanned with CamScanner

تمھارا دم غنیمت ہے۔ صاحب! مَیں تم سے پوچھتا ہوں کہ "معیارُالشّعرا" میں تم نے اپنا خط کیوں چھپوایا؟ تمھارے ہات کیا آیا؟ سُنو تو سہی، اگر سب کا کلام اچھا ہو، تو امتیاز کیا رہے؟

(۱۸۵۹ء)

(۵)

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب
اے تو غائب زنظر! مہرِ تو ایمانِ من ست

حُلیۂ مُبارک نظر افروز ہُوا۔ جانتے ہو کہ مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ نے جو کچھ تم سے کہا، اُس کا منشا کیا ہے؟ کبھی مَیں نے بزمِ احباب میں کہا ہوگا کہ مرزا حاتم علی کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے، سُنتا ہوں کہ وہ طرح دار آدمی ہیں، اَور بھائی! تمھاری طرح داری کا ذکر مَیں نے مُغل جان سے سُنا تھا، جس زمانے میں کہ وہ نواب حامد علی خاں کی نوکر تھی اَور اُن میں مُجھ میں بے تکلّفانہ ربط تھا، تو اکثر مُغل سے پہروں اختلاط ہُوا کرتے تھے۔ اُس نے تُمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مُجھ کو دِکھائے ہیں۔ بہرحال، تمھارا حُلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کِس واسطے (کہ) میرا قد بھی درازی میں انگشت نُما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا، تو میرا رنگ چنپئی تھا اَور دیدہ ور لوگ اُس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مُجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے، تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مُجھ کو رشک آیا، اَور مَیں نے خونِ جگر کھایا، تو اِس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں، جی پر کیا گزری؟ بہ قولِ شیخ علی حزیںؔ:

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ نہ دارم

جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دِن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اُس سے بڑھ کر یہ ہُوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مِسّی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اِس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام؛ مُلّا، حافظ، بِساطی، نیچہ بند، دھوبی سقّہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا: مُنھ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اُسی دِن سر مُنڈا دِیا۔ لا حَولَ وَلا قوّۃَ اِلّا بِاللّٰہِ العلیِّ العظیم۔ کیا بک رہا ہُوں؟

صاحب! بندے نے "دستنبو" جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمسٹن صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی، سو اُن کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہارِ خوشنودی بہ طریق ڈاک آگیا۔ پھر مَیں نے تہنیت میں لفٹنٹ گورنری کی قصیدۂ فارسی بھیجا، اُس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر مُتضمن خطِ فارسی بہ سبیلِ ڈاک مرقومۂ چہار دہم آگیا۔ پھر ایک قصیدۂ فارسی مدح اور تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب، لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں بہ واسطۂ صاحب کمشنر دہلی بھیجا تھا۔ کل اُن کا مُہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر دہلی آگیا۔ پنشن کے باب میں ابھی کچھ حُکم نہیں، اسباب توقّع کے فراہم ہوتے جاتے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اناج کھاتا ہی نہیں ہوں، آدھ سیر گوشت دِن کو اور پاؤ بھر شراب رات کو مل جاتی ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے   تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گُفتگو کیا ہے

اگر ہم فقیر سچّے ہیں اور اس غزل کے طالِب کا ذَوق پکّا ہے، تو یہ غزل اِس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ رہا سلام، وہ آپ پہنچا دیں گے۔

(۱۸۵۹ء)

(۶)

جناب مرزا صاحب! آپ کا غم افزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا، یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ اُنھوں نے میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا، یعنی اُس کی

اِطاعت اَور تمھاری اُس سے محبّت، سخت ملال اَور رنج کمال ہُوا۔ سُنو صاحب! شعرا میں فِردَوسی اَور فُقرا میں حسن بصری اور عُشّاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سرِ دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فِردَوسی ہو جائے، فقیر کی اِنتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکّر کھائے، عاشق کی نمُود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہووے۔ لیلیٰ اُس کے سامنے مری تھی، تُمھاری محبوبہ تُمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اُس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اَور تُمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی! مُغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں۔ مَیں بھی مُغل بچہ ہوں۔ عُمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو مَیں نے بھی مار رکھا ہے۔ خُدا اُن دونوں کو بخشے اَور ہم تُم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ بہ آں کہ یہ کوچہ چھُٹ گیا، اِس فن سے میں بے گانہ محض ہو گیا، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھُولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دِل پر کیا گُزرتی ہوگی۔ صبر کرو، اَور اب ہنگامۂ عشقِ مجازی چھوڑو۔

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی ۔۔۔۔۔ عشقِ محمدّ بس است وآلِ محمّد

اللہ بس، ما سوا ہوس

جون ۱۸۶۰ء

(۷)

مرزا صاحب!

ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عُمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سَیر کی ہے۔ اِبتدائے شباب میں ایک مُرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانِعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ، مزے اُڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مِصری کی مکھّی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اُس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے،

جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو، تو چنّا جان نہ سہی، مُنّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصوّر کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر مِلا اور ایک حوُر مِلی۔ اقامتِ جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اِس تصوّر سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ مُنھ کو آتا ہے۔ ہے ہے! وہ حور اجیرن ہوجائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی؛ وہی زمرّدیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دُور! وہی ایک حوُر۔ بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دِل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار
کہ تقویمِ پارینہ ناید بکار

مرزا منظر کے اشعار کی تضمین کا مُسدّس دیکھا۔ فکر سراپا پسند، ذِکر بہ ہمہ جہت ناپسند۔ اپنے نام کا خط مع اِن اشعار کے مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ کے حوالے کیا۔

مُکرمی نواب محمّد علی خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔ پروردگار اُن کو سلامت رکھے۔

مولوی عبدالوہاب صاحب کو میرا سلام۔ دم دے کر مجھ سے فارسی عبارت میں خط لکھوایا۔ مَیں منتظر رہا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے، وہ عبارت جناب قبلہ و کعبہ کو دِکھائیں گے۔ اُن کے مزاجِ اقدس کی خیر و عافیت مجھ کو رقم فرمائیں گے۔ مَیں کیا جانوں کہ حضرت میرے وطن میں جلوہ افروز ہیں۔

یار در خانہ و ما گردِ جہاں می گردیم

اب مجھے اُن سے یہ اِستدعا ہے کہ دستخطِ خاص سے مجھ کو خط لکھیں اور لکھنؤ نہ جانے کا سبب اور جناب قبلہ و کعبہ کا حال جو کچھ معلوم ہو وہ (سب) اس خط میں درج کریں۔

جون (۱۸۶۱ء)۔

مرزا علاء الدین احمد خاں علائی کے نام

مولانا نسیمی! کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیّر خلیفۂ اوّل ہے، تم خلیفۂ ثانی ہو، اُس کو عُمر میں تم پر تقدمِ زمانی ہے۔ جانشین دونوں، مگر ایک اوّل ہے اور ایک ثانی ہے۔

شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریقِ صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حُسنِ طبع خُداداد رکھتے ہو، ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیرِ غمزدہ، دِل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدّین خاں! تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا، اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اِس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدّین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب! دُہائی خدا کی! میں نہ تاریخِ وِلادت کہوں گا، نہ نامِ تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عُمر و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب! حُسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچّہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسمِ شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اُس کی عزّت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور محقّق ہے، اور تم صاحب بھی جانتے ہو، مگر جب تک اُس سے قطع نظر نہ کرو اور اِس مسخرے کو گم نام و ذلیل نہ سمجھ لو، تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دِلّی میں رہتا ہوں ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلّہ نہیں لکھتے۔ بہت

لوگ ایسے ہیں کہ محلّۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکّام کے خطوط، فارسی اور انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو، اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی۔ اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلّہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط پہنچنے کا میں ضامن۔

پنج شنبہ، ۴ ماہ اپریل (۱۸۶۱ء)

(۲)

جانِ غالب! یاد آتا ہے کہ تمھارے عمِ نامدار سے سُنا ہے کہ لغاتِ "دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے، اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے؟ خیر!

آں چہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اُس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نُما پائی ہے، اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اُس نہال کا رہا ہوں، کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے؟ رہی دید وادید، اُس کی دو صورتیں: تم دلّی آؤ، یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عُذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک یہ نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے؟

سُنو! عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گِل۔ حاکم اِن دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گِل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چناں چہ میں آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے

حکمِ دوام حبس صادِر ہُوا۔ ایک بیڑی میرے پانوں میں ڈال دی اور دِلّی شہر کو زِنداں مُقرر کیا اور مُجھے اِس زِنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مُشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مُجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اُسی محبس میں بٹھادیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گُریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مُشقتِ مُقرری اور مُشکل ہو گئی، طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہُوں، سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مُرادآباد ہوتا ہُوا رام پور پہنچا۔ کُچھ دِن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حُکمِ رہائی دیکھیے کب صادِر ہو؟ ایک ضعیف سا اِحتمال ہے کہ اِسی ماہِ ذی الحجّہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر، بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا، مَیں بھی بعدِ نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرّخ آں روز کہ از خانۂ زِنداں بردم
سوئے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

شنبہ، ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۷۷ھ غالبؔ

(۸ جون ۱۸۶۱ء)

(۳)

اِقبال نشانا! بہ خیر و عافیت و فتح و نُصرت لوہارو پہنچنا مُبارک ہو۔ مقصود اِن سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع "اکمل المطابع" میں چند احباب میرے مُسوّدات اُردو کے جمع کرنے اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مُسوّدات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مُسوّدہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا، وہ جہاں بھیجنا ہُوا، بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر اُن کا ایک پارسل

بنا کر بہ سبیلِ ڈاک بھیج دوگے۔ یا آج کل میں کوئی اِدھر آنے والا ہو اُس کو دے دو گے تو موجبِ میری خوشی کا ہوگا، اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اُس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہوگے۔ بچوں کو دُعا۔

(اپریل، مئی، ۱۸۶۳ء) غالب

(۴)

جانا! عالیشانا! خط آیا، حظ اُٹھایا۔ تمھاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں۔ تم کہیں، قبائل کہیں۔ والیِ شہر ناسازگار، انجام کار ناپدیدار، ایک دِل اور سَو آزار، اللہ تمھارا یاور، علی تمھارا مددگار۔ مَیں پا در رکاب، بلکہ نعل در آتش۔ کب جاؤں اور "فرخ سیر" کو دیکھوں۔ ایک خط میں نے علی حُسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اُس کا جواب آ گیا۔ رد ہیلا، پھوڑے پھنسی میں مُبتلا ہے، خدا اُس کو صحت دے۔ شمشاد علی بیگ کہاں؟ الور پہنچا اور اِس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے بھی مِل کر نہ گیا۔ خیر،

رموزِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دِن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ کم سَو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکارِ رام پور کے مہمان۔ کل یکشنبہ، ۵، دسمبر حضورِ پُرنور بڑے تجمّل سے آغا پور تشریف لے گئے، بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خان خانساماں خواصی میں سے روپے پھینکتا ہُوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار روپے سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبانِ عالی شان کی دعوت ہے۔ پٹن، شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دِن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، حُکّام کا وہ مجمع کہ اِس مجلس کو طوائف الملوک

کہا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر مع صاحبانِ عالی شان کے کل جائیں گے، کوئی کہتا ہے پرسوں۔

رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں؛ قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں، عُمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم و خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرّع، متورّع، شعر فہم، سیکڑوں شعر یاد، نظم کی طرف توجّہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں، جلالائے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں، شگفتہ جبیں ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سُن کر ایک اور نئی رُوح قالب میں آئے۔ اللّٰھمّ دام اقبالہٗ و زاد اجلالہ۔ بعد اختتامِ محافل طالبِ رُخصت ہوں گا۔ بعد حصولِ رُخصت دِلّی آجاؤں گا۔

بھائی صاحب کی خدمت میں بہ شرطِ رسائی و تابِ گویائی سلام کہنا اور بچّوں کی خیر و عافیت، جو تم کو معلوم ہوئی ہے، وہ مُجھ کو لکھنا۔

۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کی، بُدھ کا دِن، صُبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔

کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہوگے۔

(۵)

مولانا علائی! نہ مجھے خوفِ مرگ، نہ دعوائے صبر، میرا مذہب بہ خِلافِ عقیدۂ قدریہ جبر ہے۔ تُم نے میاں جی گری کی، بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو، وہ سلامت رہیں، ہم اِسی حویلی میں تا قیامت رہیں۔ اِس ایہام کی توضیح اور اِس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینہ کی شِدّت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا، اُس کی دادی بھی گھبرائی۔ مُجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رُویہ اور اُس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ درہ یاد تھا۔ جب تمھارے پانوں میں چوٹ لگی ہے، تو مَیں اُسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کا چھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پنہاری، اِن فرقوں

کا مُمَر وہ دروازہ رہے گا۔ میری اور میرے بچّوں کی آمدورفت دیوان خانے میں سے رہے گی۔ عیاذاً باللہ! وہ لوگ دیوان خانے میں سے آئیں جائیں، اپنے بیگانے کو ہر وقت پچھل پائیاں نظر آئیں۔ بی وفادار، جن کو تم مجھ اور بھائی خوب جانتے ہیں، اب تمھاری پھوپھی نے انھیں "وفادار بیگ" بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی، مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ راستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطرافِ نہر کی سیر نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تائے چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں" شرح: "تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں" ہے ہے! ایسے عالی شان دیوان خانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت۔ معہذا اس سہ درے کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے مکتب کے لیے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دُنبہ اور بکری، باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے؛ عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِم پڑھا اور چپ ہو رہا۔ مگر تمھاری خاطر عاطر جمع رہے کہ اسباب وحشت و خوف و خطراب نہ رہے۔ مینہ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے، نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا چاندنی رات، ہوا سرد، تمام رات فلک پر مرّیخ پیشِ نظر، دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ اِدھر چاند مغرب میں ڈوبا، اُدھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم

۶ ماہِ اگست ۱۸۶۲ء

غالب

(۶)

صاحب!

آگ برستی ہے، کیوں کر آگ میں گر پڑوں؛ مہینا ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو۔ دسہرے دیبھن بہت دور ہے۔ آبان و آذر میں بشرطِ حیات قصد کروں گا۔ یہ چند ورق یوسف مرزا

نے از رُوے از رُوے "دہلی اُردُو اخبار" کاتِب سے لِکھوا رکھے تھے، اَور میرے پاس پڑے ہوے تھے، ثاقِب کو دِیے، تاکہ وہ کِسی آدمی کے ہات تُم کو بھیج دے، اَور تُم میری طرف سے میرے بھائی اَور اپنے والدِ ماجِد کو دو۔ جب اُٹھا کر دیکھا کریں گے، تو کئی منٹ کی دِل لگی کو یہ اشعار مُکتفی ہو جائیں گے۔ یہ سطریں جواب میں ہیں تُمھارے اُس خط کے، جو آج اِس وقت ڈاک سے مَیں نے پایا ہے۔

نیم روز، دوشنبہ، ۲۴؍ ربیعُ الاوّل سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۳۰؍ ستمبر ۱۸۶۱ء

قاضی عبدالجمیل جنوؔن کے نام

(۱)

پیر و مرشد! فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے۔ جو حکم ہوتا ہے اُس کو بجا لاتا ہوں، مگر معدوم کو موجود کرنا میری وسیع قدرت سے باہر ہے۔ اُس زمین میں کہ جس کا آپ نے قافیہ اور ردیف لکھا ہے، میں نے کبھی غزل نہیں لکھی۔ خدا جانے مولوی درویش حسن صاحب نے کس سے اس زمین کا شعر سُن کر میرا کلام گمان کیا ہے۔ ہر چند میں نے خیال کیا، اِس زمین میں میری کوئی غزل نہیں۔ دیوانِ ریختہ چھاپے کا یہاں کہیں کہیں ہے۔ اپنے حافظے پر اعتماد نہ کر کر اُس کو بھی دیکھا، وہ غزل نہ نکلی۔ سُنیے! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں۔ چناں چہ اِنھیں دِنوں میں ایک صاحب نے مجھے آگرے سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجیے:

اسدؔ! اور لینے کے دینے پڑے ہیں

میں نے کہا کہ لاحول ولاقوۃ۔ اگر یہ کلام میرا ہو تو مجھ پر لعنت ہے۔ اِسی طرح زمانۂ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا:

اسدؔ! اِس جفا پر بُتوں سے وفا کی
مرے شیر! شاباش، رحمت خدا کی

میں نے سُن کر عرض کیا کہ صاحب! جس بزرگ کا یہ مطلع ہے، اُس پر بہ قول اُس کے اُس پر خدا کی رحمت، اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ "اسد اور شیر" اور "بُت اور خدا" اور "جفا اور وفا" یہ میری طرزِ گفتار نہیں ہے۔ بھلا اِن دو شعروں میں تو "اسد" کا لفظ بھی ہے، وہ شعر میرا کیوں کر سمجھا گیا؟ واللہ، باللہ، وہ شعر "خدنگ" "رنگ" کے قافیے کا میرا نہیں ہے۔ والسّلام۔

مرسلۂ جمعہ، ۲۵ ماہ صیام (۵،۱۲ھ) و ۲۹ اپریل سالِ حال ۱۸۵۹ء

غالبؔ

(۲)

جناب مولوی صاحب! آپ کے دونوں خط پہنچے۔ مَیں زندہ ہُوں، لیکن نیم مُردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہُوں۔ اصل صاحبِ فراش مَیں ہُوں۔ بیس بیس دن سے پانو پر ورم ہوگیا ہے۔ کفِ پا و پُشتِ پا سے نوبت گزر کر پنڈلی تک آماس ہے۔ جُوتے میں پانو نہیں سماتا۔ بَول و براز کے واسطے اُٹھنا دُشوار۔ یہ سب باتیں ایک طرف، دردِ مُحلّلِ رُوح ہے۔ سنہ ۱۲۷۷ ہجری میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا، مگر اِس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا رہا ہُوں۔ حیران ہُوں کہ کوئی صُورت زیست کی نہیں، پھر مَیں کیوں جیتا ہُوں؟ رُوح میری اب جسم میں اِس طرح گھبراتی ہے، جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، رُوح سے نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے، بے مُبالغہ اور بیانِ واقع ہے۔

خرّم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردم

ایسے مخمصے میں اگر تحریرِ جواب میں قاصر رہُوں، تو معاف ہُوں۔

صبح جمعہ، یکم محرّم سنہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۹ رجون سنہ ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب، غالب

(۳)

جنابِ عالی! وہ غزل جو کہار لایا تھا، وہاں پہنچی جہاں اب مَیں جانے والا ہُوں، یعنی عدم، مُدّعا یہ ہے کہ گُم ہوگئی۔

گھات میں مُدّعا براری کی ہم نے غیروں کی غم گُساری کی

تقدیم و تاخیرِ مِصرعتیَن کرکے رہنے دو۔ اِس میں کوئی سُقم نہیں۔ "مُدّعا براری" کا یتھوں کا لفظ ہے۔ مَیں اِس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہُوں، مگر چوں کہ مِن حَیثِ المعنیٰ یہ لفظ صحیح ہے، مُضایقہ نہیں۔

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہُوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہُوا

اِس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن وکاہ برآوردن۔ یعنی لُطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے۔ بہ قدرِ یک مژہ برہم زدن ثبات وقرار ہے۔ حیرت ازالۂ حرکت کرتی ہے۔ قطرۂ مے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بہ صورت اُس تاگے کے بن گیا، جس میں موتی پروئے ہوں۔

لیتا، نہ اگر دِل تمھیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ وفغاں اور

یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ "لیتا" کو ربط ہے "چین سے"۔ "کرتا" مربوط ہے "آہ وفغاں" سے۔ عربی میں تعقیدِ لفظی ومعنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقیدِ معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے، بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصلِ معنیِ مصرعین یہ کہ اگر دِل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ وفغاں کرتا۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

یعنی تیرا ملنا اگر آسان نہیں، تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں، نہ سہی۔ نہ ہم مِل سکیں گے نہ کوئی اور مِل سکے گا۔ مُشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں۔ جس سے تو چاہتا ہے، مِل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا، مگر رشک کو اپنے اُوپر آسان نہیں کر سکتے۔

حُسن اور اُس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں

مولوی صاحب! کیا لطیف معنی ہیں، داد دینا۔ حُسنِ عارض اور حُسنِ ظن دو صفتیں محبوب میں

جمع ہیں، یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اُس کا صحیح ہے۔ کبھی خطا نہیں کرتا، اور یہ گمان اُس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا، اور میرا تیرِ غمزہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ پس جب اُس کو اپنے اُوپر ایسا بھروسا ہے تو رقیب کا اِمتحان کیوں کرے؟ اور حُسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مُغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشقِ صادق نہ تھا، ہوس ناک آدمی تھا۔ اگر پائے اِمتحان درمیان آتا، تو حقیقت کُھل جاتی۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے، یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی، مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہوجائے۔ ایک دوست اِس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اُس نے عاشق کو کہا کہ یہ آدمی وضع دار اور مُعتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اُس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گُمان سچ ہُوا۔ قاصد مکتوب اِلیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہوگیا۔ کیسا خط؟ کہاں کا جواب؟ دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اِس واقعے کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خُدا ہے، کسی کے باطِن کی کسی کو کیا خبر؟ اے ندیم! تجھ سے کچھ کلام نہیں، لیکن اگر نامہ بر کہیں مِل جائے تو اُس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔

کوئی دِن گر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اِس میں کوئی اِشکال نہیں۔ جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا؟ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا۔ خُدا جانے شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہوکر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔

۲۴ راگست سنہ ۱۸۶۴ء

مخدوم و مکرم و معظم جناب مولوی عبد الجمیل صاحب کی خدمت میں بعد ابلاغ سلام مسنون الاسلام عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کی ارادت مجھ کو ذریعۂ فخر و ہدایت ہے۔ دو عنایت نامے آپ کے اوقات مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیے اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی پھیکی کہ حروف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔ اگرچہ بینائی میری اچھی ہے، اور میں عینک کا محتاج نہیں، لیکن بہ ایں ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلیف کرنا پڑتا ہے، علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں، چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں، تاکہ آپ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا، اور معہذا میرا اندیشہ آپ کو بدیہی ہو جائے، آپ خود دیکھ لیں کہ اس میں اصلاح کہاں دی جاوے؟ واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجیے، اس میں بین الافراد و بین المصرعین فاصلہ زیادہ چھوڑیے۔ اب کے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے، حروف اس کے روشن ہیں، مگر بین السطور مفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم۔ آپ کی خاطر سے رنج بہت اٹھاتا ہوں، اور ان دونوں غزلوں کو اس ورق پر بعد اصلاح لکھتا جاتا ہوں۔ مسوّدہ تو آپ کے پاس ہوگا، اس سے مقابلہ کر کر معلوم کر لیجیے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی، اور کیا اصلاح ہوئی۔ اور کون سی بیت موقوف ہوئی۔

مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہ ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجیے گا، اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں، اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب ہی نہ ہو۔ اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔

والسلام مع الاکرام۔

(۱۸۵۴ء) اسد اللہ

پیارے لال آشوب کے نام

جناب بابو صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان! سلامت۔

نیازِ مہر کیشانہ و دعائے درویشانہ قبول فرمائیں۔ ایک دن پہلے تفقد نامہ اور دوسرے دن نسخہ "اعجازِ ہنگامہ" پہنچا۔ نظر اس تقدیم و تاخیر پر خط کو پھول اور کتاب کو پھل سمجھا۔ پھول سے نشاطِ تازہ اور پھل سے لذتِ بے اندازہ پائی۔ جامِ جم جہاں نما ہوگا، مگر کیا جانیے، کیا ہوگا، بلکہ اسی میں تردد ہے کہ نہ ہوگا یا ہوگا۔ جامِ جہاں نما یہ کتاب ہے جس سے ہر دیدہ ور بہرہ یاب ہے۔ یہاں تو میں مدح میں قاصر رہا۔ یہ میں نے کیا کہا۔ جس طرح ہر دیدہ ور پڑھ کر حظ اٹھا سکتا ہے، نابینا بھی سُن کر لُطف پا سکتا ہے۔ فیض اس کتاب کا عام ہے۔ "جامِ جہاں نُما" اس کا سچا نام ہے۔

اسسٹنٹ کمشنر صاحب بہادر کی خدمت گزاری اور اشاعتِ علم میں مددگاری ذریعہ عزّ و افتخار ہے، مگر فقیر میں تین عیب ہیں: ستّر برس کی عمر، کانوں سے بہرا اور ہمیشہ بیمار۔ آمد و رفتِ دوام میں قاصر رہے گا۔ یہ نہیں ہے کہ نہ جاؤں گا، مگر حسبُ الطلب یا حسبِ ضرورت کارگزار و فرماں بردار رہوں گا۔ بہ ہر صورت تعجب ہے کہ صاحب اسسٹنٹ بہادر نے مجھے کیوں نہ کہا؟ بُلا کیوں نہ لیا؟ یقین ہے کہ جب آپ یہ خط اپنے نام کا حضرت کی خدمت میں بھجوا دیں گے، تو وہ مجھے بے تکلف بُلا لیں گے۔

اوائل اگست ۱۸۶۵ء عنایت کا طالب۔ غالب

(۲)

فرزند ارجمند اقبال بلند بابو ماسٹر پیارے لال کو غالب ناتواں نیم جاں کی دُعا پہنچے۔ لاہور پہنچ کر تم نے مجھے خط نہ بھیجا۔ اُس کی میں جتنی شکایت کروں بجا ہے۔ تم

نہیں جانتے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ میں تمھارا عاشق ہوں، اور کیوں نہ عاشق ہوں؛ صورت کے تم اچھے، سیرت کے تم اچھے، شیوہ و روش کے تم اچھے، خالق نے خوبیاں تم میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ اگر میرا صلبی فرزند ایسا ہوتا جیسے تم ہو، تو میں اس کو اپنا فخرِ خاندان سمجھتا، اور اب تم جس قوم اور جس خاندان میں ہو، اس قوم اور اس خاندان کے ذریعۂ افتخار ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور عمر و دولت و اقبال و جاہ و جلال عطا کرے۔

میاں! تم کو یاد ہے کہ میں نے تم کو سابق اس سے نورِ چشم مرزا یوسف علی خاں کے باب میں کچھ لکھا ہے۔ میرے اختلالِ حواس کا حال تم جانتے ہو۔ خدا جانے اُس وقت کس خیال میں تھا، اور میں کیا لکھ گیا۔ وہ جو کچھ لکھا وہ سہل انگاری تھی، اب جو کچھ لکھتا ہوں، یہ راست گفتاری ہے۔ مختصر یہ یعنی مرزا یوسف علی خاں عزیز بڑے عالی خاندان اور بڑی بزرگ قوم کے ہیں۔ شاعر بھی بہت اچھے ہیں، شعر خوب کہتے ہیں۔ صاحبِ استعداد ہیں، علم ان کو اچھا ہے، یہ بھی گویا فرقۂ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں اور ترقی کے قابل ہیں۔

نورِ چشم مولوی نصیر الدین کو میری دعا کہنا۔

محررۂ ۳۰ر جنوری ۱۸۶۸ء۔

(۳)

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ۔۔۔ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے، ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں، اور اُن کو صیقل کون کرتا ہے؟ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اُس کو الف صیقل کرنا کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہو گیا، تو اب اس مفہوم کو سمجھیے:

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سنِ تمیز سے مشقِ جنوں ہے، اب تک کمالِ فن نہیں حاصل ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا، پس، وہی ایک لکیر صیقل کی، جو ہے سو ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب آثارِ جنوں میں سے ہے۔

غالب

غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام

سید صاحب! تم نے جو خط میں برخوردار کامگار میرزا عبّاس بیگ خاں کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے، تم کیوں شکرگزار ہوتے ہو؟ جو کچھ نیکی اور نکوئی اُس اقبال نشان نے تمھارے ساتھ کی ہے، وہ بعینہٖ میرے ساتھ کی ہے۔ اُس کا سپاس میں ادا کروں۔ خُدا کی قسم دل سے دُعائیں دے رہا ہوں۔ بھائی! اُس کا جوہرِ طبع زاد از رُوئے فطرت شریف ہے۔ پروردگار اُس کو سلامت رکھے، اور مدارجِ اعلیٰ کو پہنچائے۔ یہ اپنے والدین کے خاندان کا فخر ہے، اور چوں کہ اُس کی ماں کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے، پس وہ فخر میری طرف بھی عائد ہوتا ہے۔ وہ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ ماموں میری لڑکی کے بیاہ میں نہ آیا، اور صرف اپنے زر سے جی چرایا ہے۔ میں تو زر کو خاک و خاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا، مگر کیا کروں کہ مجھ میں دم ہی نہ تھا۔ کاش کے جب ایسا ہوتا جیسا کہ اب ہوں، تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اُس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے، دیکھوں، اُس کا دیکھنا کب میسّر آتا ہے میں اب اچھا ہوں۔ برس دن صاحبِ فراش رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم خوں چکاں۔ ایک درجن پھائے لگ جاتے تھے۔ جسم میں جتنا لہو تھا، پیپ ہو کر نکل گیا۔ تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے، وہ کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی کھاتا ہوں، کبھی پیتا ہوں۔ مرض کے آثار میں سے اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پاؤں کی دو دو اُنگلیاں ٹیڑھی ہوگئی ہیں، معہٰذا مُتورّم ہیں۔ جوتا نہیں پہنا جاتا۔ ضُعف کا تو بیان ہی نہیں ہوسکتا، مگر ہاں یہ میرا شعر:

درکشاکشِ ضُعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

اب کے رجب یعنی ماہِ آئندہ کی آٹھویں تاریخ سے ستّرواں برس شروع ہوگا۔

چو ہفتاد آمد، اعضا رفت از کار

پس اب شکوۂ ضعف نادانی ہے، ایمان سلامت رہے۔

سہ شنبہ، ۲۴ر نومبر ۱۸۶۳ء

نجات کا طالب، غالبؔ

(۲)

بندہ پرور!

آپ کے عنایت نامے کے آنے سے تین طرح کی خوشی مُجھ کو حاصل ہوئی۔ ایک تو یہ کہ آپ نے مُجھ کو یاد کیا، دوسرے آپ کی طرزِ عبارت مُجھ کو پسند آئی، تیسرے آپ حضرت علامۂ عبدالجلیل اور آزاد مغفور کی یادگار ہیں، اور مَیں اُن کے حُسنِ کلام کا مُعتقد۔ خواہش آپ کی کیا مُمکن ہے کہ مقبول نہ ہو؟ جب مزاج میں آئے، آپ نظم و نثر بھیج دیں، مَیں دیکھ کر بھیج دیا کروں گا۔ اور آرائشِ گفتار یعنی حک و اصلاح میں کوشش دریغ نہ ہوگی۔

بارہ برس کی عمر سے کاغذ نثر و نظم میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عُمر ہوئی، پچاس برس اِس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم مَوقوف۔ اُردو، سو اُس میں بھی عبارت آرائی متروک۔ جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔ پانو رکاب میں ہے اور ہات باگ پر۔ کیا لکھوں اور کیا کروں؟ یہ شعر اپنا پڑھا کرتا ہوں:

عُمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے، پر دیکھیے دِکھلائیں کیا

آپ مُلاحظہ فرمائیں؛ ہم اور آپ کِس زمانے میں پَیدا ہوئے ہیں؟ اور کی فیض رسانی

اور قدر دانی کو کیا روئیں، اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں۔ تباہیِ ریاست نے باآں کہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ دِل کر دیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند جو افسردہ دِل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔

کل آپ کا خط آیا، آج میں نے جواب لکھا، تاکہ اِنتظارِ جواب میں آپ کو ملال نہ ہو۔

والسلام مع الاکرام۔

نگاشتۂ بست و سوم فروری سنہ ۱۸۵۷ء

از اسداللہ

(۳)

حضرت!

فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اِصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر سُننا تو ممکن ہی نہیں۔ بہرا ہوں۔ شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتّر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صِلا مِلا، نہ غزل کی داد۔ بقولِ انوری ؎

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح

وے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شُعرا اور احباب سے مُتوقع ہوں کہ مجھے زُمرۂ شُعرا میں شمار نہ کریں، اور اِس فن میں مجھ سے کبھی پُرسش نہ ہو۔

(۱۸۶۸ء) اسداللہ خاں المتخلص بہ غالب

والمخاطب بہ نجم الدولہ، خُدایش بیامرزاد

یوسف مرزا کے نام

یوسف مرزا !

میرا حال سوائے میرے خُدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہوجاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اِس ہجومِ غم میں میری قوّتِ مُتفکّرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے ؟ بلکہ اِس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پُوچھو کہ غم کیا ہے ؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزّت۔ غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطعِ نظر کرکے اہلِ شہر کو گِنتا ہوں۔ مُظفّر الدّولہ، میر ناصر الدّین، مرزا آشور بیگ، میرا بھانجا، اُس کا بیٹا احمد مرزا اُنیس برس کا بچّہ، مصطفےٰ خاں ابنِ اعظم الدّولہ، اُس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مُرتضیٰ خاں قاضی فیضُ اللہ، کیا مَیں اِن کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھُول گیا؛ حکیم رضیُ الدّین خاں، میر احمد حُسین میکش۔ اللہ اللہ ! اِن کو کہاں سے لاؤں ؟ غمِ فراق؛ حُسین مرزا، یوسُف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حُسین، میرن صاحب، خُدا اِن کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے، گھر اِن کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجّاد اور اکبر کے حال کا جب تصوّر کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ اِن اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا۔ اُس کی بیٹی، اُس کے چار بچّے، اُن کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اِس تین برس میں ایک روپیا اُن کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور اُمرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں ! اِس مُصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔ اب خاص اپنا دُکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچّے، تین چار آدمی گھر کے، کلّو، کلیان، ایاز، یہ باہر۔ مداری کے جورو بچّے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھُمن گئے گئے مہینا بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھّا بھائی ! تم بھی رہو۔ ایک پیسہ

کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقامِ معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے۔ وہ بقدر سدِّ رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دِن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں، بھوت نہیں۔ اِن رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں؟ بڑھاپا، ضعفِ قُویٰ۔ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہے۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں، گویا فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق، جو بہ قدر طاقت بنائے رکھتا تھا، اب میسّر نہیں۔ سب سے بڑھ کر آمد آمدِ گورمنٹ کا ہنگامہ ہے۔ دربار میں جاتا تھا، خلعت فاخرہ پاتا تھا، وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں، نہ مردود، نہ بے گناہ ہوں، نہ گنہ گار ہوں، نہ مخبر نہ مفسد۔ بھلا تم ہی کہو کہ اگر یہاں دربار ہُوا اور مَیں بُلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں۔ دو مہینے دِن رات خونِ جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا، محمد فضل مصوّر کو دے دیا۔ پہلی دِسمبر کو مجھ کو دے گا۔ یہ اُس کا مطلع ہے۔

زسالِ نو، دگر آئے بروئے کار آمد

ہزار و ہشت صد و شست در شمار آمد

اِس میں اِلتزام اپنی تمام سرگزشت کے رکھنے کا کیا ہے۔ اِس کی نقل تم کو بھیجوں گا۔ میرے آقازادۂ روشن گہر جناب مُفتی میر عبّاس صاحب کو دِکھانا۔ اِس بُجھے ہوئے بلکہ مرے ہوئے دِل پر کلام کا یہ اُسلوب ہے۔ جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گُزرا نہ تھا۔ مَیں نے اِسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بِٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ مَیں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہُوا؟ اور پھر کیسی حالت اور کیسی مُصیبت میں، کہ جس کا ذکر بہ طریقِ اِختصار اُوپر لکھ آیا ہوں۔ اِس قصیدے سے مُجھ کو عرضِ دستگاہِ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔ بہ ہرحال، یہ تو کہو قصیدہ پہنچا یا نہیں پہنچا؟ پرسوں تمھارے ماموں کا خط آیا، وہ قصیدے کا پہنچنا لکھتے ہیں۔ کل تمھارا خط آیا، اس میں قصیدے کے

پہنچنے کا ذکر نہیں۔ اِس تفرقے کو مٹاؤ، اَور صاف لِکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں؟ اگر پہنچا، تو حضور میں گزرا یا نہیں؟ اگر گزرا تو کس کی معرفت گزرا اور کیا حکم ہُوا؟ یہ اُمور جلد لکھو۔ اَور ہاں یہ بھی لِکھو کہ اِملاک واقع شہرِ دہلی کے باب میں کیا حکم ہُوا؟ مَیں تُم کو اِطلاع دیتا ہُوں کہ کل مَیں نے فردِ فہرست دیہات و باغات و املاک مع حاصل ہر یک باغ و دہ و مِلک ناظر جی کو بھیج دی ہَے۔ اِس خط سے ایک دِن پہلے وہ فرد پہنچے گی۔ یہ فرد کلکٹر کے دفتر سے لی ہَے، مگر اِتنا ہی معلوم ہَے کہ شہر کی عمارت جو سڑک میں نہیں آئی، اور برسات میں ڈھ نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہَے، کرایہ دار کا نام نہیں۔ مُجھ کو یہاں کی اِملاک کا علاقہ، حُسین مرزا صاحب کے واسطے مطلوب ہَے۔ مَیں تو پِنسن کے باب میں حُکم اخیر سُن لوُں، پھر رام پور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاوّل سے ذی الحجہ تک آٹھ مہینے، اور محرم سے ۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا اُس سال کے دو چار، حد دس گیارہ مہینے، غرض کہ انیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہَیں۔ اِس میں رنج و راحت، ذِلّت و عِزّت، جو مقسوم میں ہَے وہ پہنچ جائے گی۔ اور پھر "علی، علی" کہتا ہُوا مُلکِ عدم کو چلا جاؤں۔ جسم رام پور میں اور روح عالمِ نور میں۔ یا علی! یا علی! یا علی!

میاں! ہم تُمھیں ایک اور خبر لکھتے ہَیں۔ برہما کا پِسّر دو دِن بیمار پڑا۔ تیسرے دِن مر گیا۔ ہَے ہَے! کیا نیک بخت غریب لڑکا تھا۔ باپ اُس کا شیو جی رام اُس کے غم میں مُردے سے بدتر ہَے۔ یہ دو مُصاحب میرے یوُں گئے۔ ایک مُردہ، ایک دِل افسردہ۔ کَون ہَے جس کو تُمھارا سلام کہوُں؟ یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا، اور فرد اُن سے لے کر پڑھ لینا، اور جس طرح اُن کی رائے میں آئے، اُس پر حصولِ مطلب کی بِنا اُٹھانا، اور اُن سب مدارج کا جواب شتاب لِکھنا۔ ضیاء الدّین خاں رُہتک چلے گئے اور وہ کام نہ کر گئے، دیکھیے آ کر کیا کہتے ہَیں؟ یا رات کو آ گئے ہوُں، یا شام تک آ جائیں۔ کیا کروُں؟ کس کے دِل میں اپنا دل ڈالوُں؟ بہ مرتضیٰ علی! پہلے سے نیّت میں یہ ہَے کہ جو شاہ اودھ سے ہات آئے حِصّہ برادرانہ کروں، نِصف حُسین مرزا اور تُم اور سجّاد، نصف میں مُفلسوں کا مدارِ حیات خیالات پر ہَے۔ مگر اِسی خیالات سے اُن کا حُسنِ طبیعت معلوم ہو جاتا ہَے۔

والسلام خیر ختام۔

دوشنبہ، دوم جمادی الاول سنہ ۱۲۷۶ ہجری

مطابق ۲۸ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء وقتِ صبح

(۲)

یوسف مرزا!

کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا! اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب صبر کیا کرو۔ مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں تو نہ تڑپھ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپھے گا؟ صلاح اِس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دُعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا، مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔

تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہوچکا تھا۔ یہ بات سچ ہے، اگر سچ ہے تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ۔ ہاں صاحب! وہ لکھتی ہیں کہ پنسن کا روپیا مِل گیا تھا، وہ تجہیز و تکفین کے کام آیا۔ یہ کیا بات ہے؟ جو مجرم ہوکر چودہ برس سے مقید ہوا ہو، اُس کا پنسن کیوں کر ملے گا؟ کس کی درخواست سے ملے گا؟ رسید کس سے لی جائے گی؟ مصطفےٰ خاں کی رہائی کا حکم ہوا، مگر پنسن ضبط۔ ہرچند اِس پُرسش سے کچھ حاصل نہیں، لیکن بہت عجیب بات ہے۔ تمھارے خیال میں جو کچھ آئے وہ مجھ کو لکھو۔ دوسرا امر یعنی تبدیلِ مذہب، عیاذاً باللہ! علی کا غلام کبھی مُرتد نہ ہوگا۔ ہاں، یہ ٹھیک کہ حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہوں گے کہ اِن دموں میں اپنا کام نکالو اور رہا ہوجاؤ۔ عقیدہ کب بدلتا ہے۔ اگر یہ بھی تھا، تو اُن کا گمان غلط تھا۔ اِس طرح رہائی ممکن نہیں۔ قصّہ مختصر، تمھاری دادی کا خط، جو تمھارے بھائی نے مجھ

کو بھیجا تھا، وہ مَیں نے تمھارے ماموں کے پاس بھیج دیا۔ اُن کی جاداد کی واگزاشت کا حُکم تو ہوگیا ہے، اگر اُن کے بڑے بھائی کے یار اُن کو چھوڑ دیں۔ دیکھیے، انجام کار کیا ہوتا ہے۔ مُظفّر مرزا کو دُعا پہنچے۔

تمھارا خط جواب طلب نہ تھا۔ تمھارے چچا کا آغاز اچھا ہے، خُدا کرے انجام اِسی آغاز کے مُطابِق ہو۔ اُن کا مُقدّمہ دیکھ کر تمھاری پھوپھی اور تمھارا سرانجام دیکھا جاوے گا کہ کیا ہوتا ہے؟ ہوگا کیا؟ اگر جادادیں مِل بھی گئیں تو قرض دار دام دام لے لیں گے۔ رزّاقِ حقیقی پِنسن دِلوادے کہ روٹی کا کام چلے۔

جناب میر قُربان علی صاحب کو میرا سلامِ نیاز، اور میر کاظِم علی کو دُعا۔

مرقومہ شنبہ، ۲۷ر شوّال و ۱۹ر مئی سال حال

غالِب (۱۲۷۶ھ - ۱۸۶۰ء)

نواب محمد یوسف علی خان بہادر کے نام

خُداوندِ نعمت ! سلامت۔

جو آپ بِن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے اِنکار نہیں، اَور جب مجھ کو حاجت آ پڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔

بارِ گرانِ غم سے پست ہوگیا ہوُں۔ آگے تنگ دست تھا، اب تہی دست ہوگیا ہوُں۔ جلد میری خبر لیجیے اَور کچھ بھجوا دیجیے۔

چہارشنبہ، یازدہم ربیعُ الثّانی سنہ ۱۲۷۵ھ و ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء

عنایت کا طالِب، غالبؔ

(۲)

حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت، سلامت ! بعدِ تسلیم معروض ہے، کِس زبان سے کہوُں اَور کِس قلم سے لِکھوں کہ ہفتۂ عشرہ کِس ترَدّد و تشویش سے بسر ہوُا ہے۔ ہر روز شام تک جانبِ درِ نِگراں رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے اَور حضرت کا نوازش نامہ لائے۔ بارے خُدا کی مہربانی ہوئی، از سرِ نَو میری زندگانی ہوئی کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ عطوفت نامۂ عالی دِیا، جِس کو پڑھ کر روحِ تازہ رگ و پَے میں دَوڑ گئی۔ نیند کِس کی ؟ سونا کِس کا ؟ روشنی کے سامنے بیٹھا اَور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سات شِعر مع مادّۂ حصوُلِ صحت جب لِکھ لیے تب سویا۔ اب اِس وقت وہ مسوّدہ صاف کر کے اِرسال کرتا ہوُں۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دِن پچاس ہزار

۲۷ نومبر ۱۸۶۴ء

خَیر و عافیت کا طالِب، غالبؔ

منشی شیونراین آرام کے نام

برخوردار نورِ چشم منشی شیونراین کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو، تو معلوم ہوا کہ میرے فرزندِ دل بند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ گار۔ تم کو اپنے خاندان اور ہمارے خاندان کی آویزش کا حال کیا معلوم ہے؟ مجھ سے سنو! تمھارے دادا کے والد عہدِ نجف خاں و ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے، تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھولی، اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں، مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر خان صاحب کے ساتھ ہیں، اور انھوں نے جو کیتھم گانو میں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے، تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے، شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر، اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چوں کہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا، اس واسطے جب چاہتے تھے، چلے جاتے تھے۔ بس، ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی، اور پاس اس کے ایک "کھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی، اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا، اور ایک کٹڑہ کہ وہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ "واصل خاں" نامی ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیش دست رہتا تھا، اور وہ کٹڑوں کا کرایہ اد گاہ کر ان کے پاس جمع کرواتا تھا۔

بھائی! تم سُنو تو سہی، تمھارا دادا بہت کچھ پَیدا کر گیا ہَے۔ عِلاقے مول لیے تھے، اَور زمینداراں اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپیے کی سرکار کی مال گُزاری کرتا تھا۔ آیا وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں؟ اُس کا حال از رُوئے تفصیل مجھ کو لکھو۔

روزِ سہ شنبہ، ۱۹ر اکتوبر بر وقتِ ورُودِ خط (۱۸۵۸ء)

اسدُاللہ

(۲)

برخوردار مُنشی شیونراین کو دُعا کے بعد معلوم ہو:

تصویر پہنچی، تحریر پہنچی۔ سُنو؛ میری عُمر ستّر برس کی ہَے اور تمھارا دادا میرا ہم عُمر اور ہم باز تھا، اور مَیں نے اپنے نانا صاحب خواجہ غلام حُسین مرحوم سے سنا کہ تمھارے پر دادا صاحب کو اپنا دوست بتاتے تھے اور فرماتے تھے کہ مَیں بنسی دھر کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں۔ غرض اِس بیان سے یہ ہَے کہ سَو سوا سَو برس کی ہماری تمھاری مُلاقات ہَے، اور پھر آپس میں نامہ و پیام کی راہ و رسم نہیں، اور اِس راہ و رسم کے مسدُود ہونے کا حاصِل یہ ہَے کہ ایک (کو) دوسرے کے حال کی خبر نہیں۔ اگر تم کو میرے حال سے آگاہی ہوتی، تو مُجھ کو بہ سبیلِ ڈاک کبھی اکبر آباد نہ بُلاتے۔

لو، اب میری حقیقت سُنو۔ چھٹا مہینا ہے کہ سیدھے ہاتھ میں ایک پھُنسی ہوئی۔ پھنسی نے صُورت پھوڑے کی پَیدا کی۔ پھوڑا پک کر، پھُوٹ کر، ایک زخم کیا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جرّاحوں کا عِلاج رہا۔ بگڑتا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا عِلاج ہَے۔ سلائیاں دوڑ رہی ہَیں۔ اُسترے سے گوشت کٹ رہا ہَے۔ بیس بیس دن سے صُورت اِفاقت کی نظر آنے لگی ہَے۔

اب ایک اَور داستان سنو۔ غدر کے رفع ہونے اَور دِلّی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنسن کھُلا۔ چڑھا ہوا رُوپیا دام دام مِلا۔ آئندہ کو بہ دستور بے کم و کاست جاری ہُوا، مگر لاٹ صاحب کا دربار اَور خلعت جو معمولی و مُقرّری تھا، مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مُجھ سے

نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیرِ متکبر، مایوسِ دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا، اور حکّامِ شہر سے بھی ملنا میں نے موقوف کر دیا۔ بڑے لاٹ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادرِ پنجاب بھی دلّی آئے دربار کیا، خیر، کرو۔ مجھ کو کیا؟ ناگاہ، دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا۔ اور کہا کہ نوّاب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی! یہ آخر فروری ہے، اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اِس دائیں ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں۔ اُٹھنا دشوار ہے۔ بہ ہر حال، سوار ہوا، گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا، پھر نوّاب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصوّر میں کیا، بلکہ تمنّا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی، یعنی عنایت سی عنایت، اخلاق سے اخلاق۔ وقتِ رُخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ "یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے از راہِ محبّت دیتے ہیں، اور مژدہ دیتے ہیں کہ لاٹ صاحب کے دربار میں بھی تیرا مبر اور خلعت کھُل گیا۔ انبالے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن" حال عرض کیا گیا۔ فرمایا "خیر، اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا" اِس پھوڑے کا بُرا ہو، انبالے نہ جا سکا، آگرے کیوں کر جاؤں؟

بابو ہرگوبند سہائے صاحب کو سلام، مضموُن واحد۔

۳ رمئی (۱۸۶۳ء)

یوسف علی خاں عزیزؔ کے نام

بھائی ! تم کیا فرماتے ہو ؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لُٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لُٹتا۔ ہاں، بھائی ضیاءُ الدّین خاں صاحب اور ناظر حُسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسوّدات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر مَیں اپنا کلام کہاں سے لاؤں ؟

ہاں، تم کو اِطّلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اِکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال مَیں نے نثر میں لکھا ہے، اور وہ نثرِ فارسی زبانِ قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظِ عربی نہ آئے۔ اور ایک قصیدہ فارسی مُتعارف، عربی اور فارسی مِلی ہوئی زبان میں، حضرتِ فلک رِفعت جناب ملکۂ مُعظّمۂ انگلستان کی ستایش میں اُس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کِتاب مطبعِ مُفیدِ خلایق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیرؔ اور مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ اور منشی ہرگوپال تفتہؔ کے اِہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اُس کے سوا کہیں نہیں۔ اگر جناب مُنشی امیر علی خاں صاحب میرے کلام کے مُشتاق ہیں تو یہ نُسخہ مَوسوم بہ "دستنبو" مطبعِ مُفیدِ خلایق سے منگا لیں اور مُلاحظہ فرمائیں۔

۱۸۵۹ء۔

(۲)

میاں !

کل زینُ العابدین فوقؔ کا خط، مع اشعار کے، ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر

بہ سبیلِ ڈاک بھجوا دیا ہے۔ آج صبح کو تمھارا خط آیا، دوپہر کو میں نے جواب لکھا، تیسرے پہر کو روانہ کیا۔ "موتیوں کا پھنکا" البتہ بہت مناسب ہے، خیر "موتیوں کا نوالہ" بھی سہی۔

حافظ کے شعر کی حقیقت جب سمجھو گے کہ قواعدِ مقررۂ اہلِ سخن دریافت کر لو گے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر مطلع میں یا اور اشعار میں قافیے کی احتیاج آ پڑے، اور اس کی اطلاع ایک شعر میں کر دیں تو وہ عیب جاتا رہتا ہے، جیسا کہ اُستاد کا قطعہ ہے۔ اس میں "ریو" و "غریو" و "کالیو" قافیہ ہے، اور شعر اخیر قطعہ کا یہ ہے۔ شعر؛

غلط کردم دریں معنی کہ گفتیم

زنخدانِ نگارِ خویش را سیو

حالاں کہ صحیح "سیب" ہے بہ بائے موحدہ۔ شاعر نے اطلاع دی کہ میں نے غلط کیا جو "سیو" لکھا۔ اسی طرح حافظ فرماتا ہے؛

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

حاصل اِس کا یہ کہ دیکھ کتنا تفاوت ہے۔ ایک جگہ حرفِ روی ساکن اور ایک جگہ متحرک، مگر یہاں بھی معترض کو گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ ہاں تفاوت کو ہم بھی جانتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ یہ تفاوت تم نے کیوں روا رکھا؟ اِس کا جواب پہلا مصرعہ ہے۔

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا

یعنی حافظ فرماتا ہے کہ میں عاشقِ زار و دیوانہ ہوں، صلاح کار سے مجھ کو کیا کام ہے؟

پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے، تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ "سانس" میرے نزدیک مذکر ہے، لیکن اگر کوئی مونث بولے گا تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا۔ خود "سانس" کو مونث نہ کہوں گا۔ سیف کو "عدو کش" کہو اور "کمند" کو "عدو بند"۔ سیف "عدو بند" نہیں ہو سکتی۔ تم کو کہتا ہوں کہ تم "تلوار" کو "عدو بند" نہ کہو کوئی اگر کہے تو اُس سے نہ لڑو۔ "زلف" کو "شب رنگ" اور "شب گوں" کہتے ہیں۔ "شب گیر" زلف کی صفت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ "شب گیر" اُس سفر کو کہتے ہیں کہ پہر پچھلے گھڑی

رات رہے چل دیں۔ "نالۂ شب گیر" "آہ و زاریِ آخرِ شب" کو کہتے ہیں۔ "زلفِ شب گیر" نہ مسموع نہ معقول۔ سخن کا قافیہ "بُن" بھی درست ہے اور "تن" بھی جائز ہے۔ یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی ہے، اور اِس پر مُتقدّمین اور مُتاخّرین اور اہلِ ایران اور اہلِ ہند کو اِتّفاق ہے۔ قُبّۂ خشخاش پوست کے ڈوڈے کو کہتے ہیں، اِس میں کچھ تامّل نہ چاہیے۔

تُم اپنی تکمیل کی فکر میں رہا کرو، زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔ والدُّعا۔

مرزا قربان علی بیگ خاں سالک
کے نام

ولِلّٰہِ الرَّحمٰنِ اَلطافُ خَفِیَّۃ۔ خیر و عافیت تمھاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے۔ جان ہے وجہان ہے۔ کہتے ہیں کہ خُدا سے نااُمیدی کُفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے نااُمید ہوکر کافرِ مُطلق ہو گیا۔ مُوافقِ عقیدۂ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی! نہ دُنیا نہ دین۔ مگر تم حتّی الوسع مُسلمان بنے رہو، اور خُدا سے نااُمید نہ ہو۔ اِنَّ مَعَ الْیُسْرِ یُسْرا کو اپنا نصبُ العین رکھو۔

در طریقت ہر چہ پیشِ سالک آید خیرِ اوست

گھر میں تمھارے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ محمد میرزا پنج شنبہ اور جُمعے کو داستان کے وقت آجاتا ہے، رضوان ہر روز شب کو آتا ہے۔ یوسف علی خاں عزیز سلام اور باقر اور حُسین علی بندگی کہتے ہیں۔ کلّو داروغہ کورنش عرض کرتا ہے۔ اوروں کو یہ پایہ حاصل نہیں کہ وہ کورنش بھی بجالائیں۔ خط بھیجتے رہا کرو۔ والدّعا۔

صُبحِ دوشنبہ، ۶، صفر سال حال (۱۲۸۱ھ)

۱۱ر جولائی ۱۸۶۴ء　　　　　　اپنی مرگ کا طالب، غالبؔ

(۲)

میری جان! کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ تُجھ کو خُدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورتِ وقوعی دے۔
یہاں خُدا سے بھی توقّع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ

تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلّت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی مَیں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے۔ جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں، کہ لو! غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اِتراتا تھا کہ میَں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے، اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا مُلحِد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشیمن" خطاب دیتے ہیں، چوں کہ یہ اپنے کو شاہِ قلمرِو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے، آئیے! نجم الدّولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سُنا رہا ہے۔ مَیں اُن سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نوّاب صاحب! نوّاب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حُرمتی ہو رہی ہے؛ کچھ تو اُکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گُلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صرّاف سے دام قرض لیے جاتا ہے، یہ بھی تو سوچا ہوتا، کہاں سے دوں گا؟

مولانا احمد حسین میناؔ مرزاپوری کے نام

بندہ پرور !

کل دوپہر کو آپ کے عنایت نامے کے ساتھ ہی جناب اخگرؔ کا مہربانی نامہ مع غزل پہنچا۔ آج جواب آپ کو لکھتا ہوں۔ غزل مَیں نے دیکھ لی۔ سوائے دو ایک جگہ کے کہیں اِصلاح کی حاجت نہ تھی۔ آج اِس فن میں وہ یکتا ہیں۔ خُدا اُن کو سلامت رکھے۔ وہ بلامُبالغہ تصویرِ محبّت ہیں، نظم تو نظم، اُن کی نثر کے فقرے بھی قیامت ہیں۔

اِس دوبارہ عطیے اَور اِس یاد آوری کا احسان مانا۔ میری جانب سے قدر افزائی کا شکریہ ادا کر دیجیے گا کہ حضرت نے ہیچمیرز، ہیچمداں کو قابلِ خطاب و لائقِ جواب سمجھا۔ مَیں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں۔ غزل دیکھی، الفاظ متین، معانی بلند، بندش دل پسند، مضمون عُمدہ، سوائے دو ایک جگہ کے اَور غزل بھر میں ایک نُقطے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ اِصلاح کیا دیتا، بجنسہٖ واپس کرتا ہوں۔

اب یہاں سے روئے سخن حضرت اخگرؔ کی طرف ہے۔

قبلۂ حاجات ! میرا حال کیا پوچھتے ہیں۔ زندہ ہوں مگر مُردے سے بدتر۔ جو حالت میری آپ اپنی آنکھوں سے مُلاحظہ فرما گئے تھے، اب تو اُس سے بھی بدتر ہے۔ مرزا پوُر کیا آؤں ؟ اب سوائے سفرِ آخرت اَور کسی سفر کی نہ مُجھ میں طاقت ہے نہ جُرأت۔ جوان ہوتا، تو احباب سے دُعائے صحت کا طلب گار ہوتا۔ بوڑھا ہوں، تو دُعائے مغفرت کا خواہاں ہوں ؛

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو ! اب اللہ ہی اللہ ہے

سچ تو یہ ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرّف اَور قلم میں وہ زور نہ رہا۔ طبیعت میں وہ مزہ ،

سر میں وہ سودا کہاں ؟ پچاس پچپن برس کی مشق کا کچھ ملکہ باقی رہ گیا ہے ، اِس سبب سے فنِ کلام پر گفتگو کر لیتا ہوں ۔ حواس کا بھی بقیہ میرے اِس شعر کا مصداق ہے !

مُضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ !
وہ عناصر میں اِعتدال کہاں ؟

حوادثِ زمانہ و عوارضِ جسمی سے نیم جاں ہوں ۔ اِس سرائے فانی میں اور کچھ دِنوں کا مہمان ہوں ۔

ہو چکیں غالبؔ ! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

جب تک جیتا ہوں ، نامہ و پیام سے شاد ، بعد میرے ، دُعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے گا !

سانس میری زبان پر مذکر ہے ۔ رندؔ کا یہ مطلع :

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلّاد نے جاتے جاتے

میرے لیے سند نہیں ۔

بندہ پرور ! لکھنؤ اور دہلی میں تذکیر و تانیث کا بہت اِختلاف پائیے گا ۔ سانس میرے نزدیک مُذکّر ہے ، لیکن اگر اہلِ لکھنؤ اُسے مونّث کہیں ، تو میں اُن کو منع نہیں کر سکتا ، خود سانس کو مُونّث نہ کہوں گا ۔ آپ کو اختیار ہے جو چاہے کہیے ، مگر جفا کے مونّث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اِتّفاق ہے ۔ کبھی کوئی نہ کہے گا "جفا کیا" ۔

چشمِ بد دُور ، حضرت کی طبیعت نہایت اعلیٰ اور مناسب اِس فن کے ہے ۔ اللہ نگاہِ بد سے محفوظ رکھے ۔

۱۸۶۷ء

نجات کا طالب ، غالبؔ

جانِ غالبؔ! کل تمھاری دونوں غزلیں بعدِ اصلاح، ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر بھجوا دی ہیں۔ مطلع تو تم نے میری زبان سے کہا ہے؛

ادائے یوسفی ہے لوٹ قاتل کے لڑکپن پر
سوادِ دیدۂ یعقوب کے دھبّے ہیں دامن پر

اس زمین میں میری بھی غزل ہے اور ناسخؔ و آتشؔ کی بھی غزلیں میں نے دیکھی ہیں۔ تم نے بہت بڑھ کر لکھا ہے۔ گردن کا قافیہ بھی مجھے پسند آیا ہے؛

نزاکت اُن کی وقتِ قتل، مقتل میں یہ کہتی ہے
یہ اِتنے خونِ ناحق جس سے اُٹھیں، اُس کی گردن پر

غرض کہ ساری غزل بے مثل و لاجواب ہے۔ کیوں نہ ہو، ابھی تمھارا شباب ہے۔ زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچایا ہے۔ اِس غزل میں تو تم نے جوانی کا زور دِکھایا ہے۔

قصیدہ کا وعدہ نہیں کرتا، اگر بے وعدہ پہنچ جائے گا، لُطف زیادہ آئے گا، اور اگر نہ پہنچے گا، تو محلِ شکایت نہ ہوگا۔

بندہ پرور! میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اُردو، کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہُوا۔ دو چار دوستوں کو اِس کی فکر تھی، وہ مُسوّدات مُجھ سے لے کر جمع کرتے تھے، سو اُن دوستوں کا زمانۂ غدر میں گھر ہی لُٹ گیا۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا، پھر مَیں اپنا کلامِ نظم و نثر کہاں سے لاؤں؟

مولوی فرزند علی صاحب انگرؔ کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا؟ حُسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں اُن میں جمع ہیں۔ فقیر تو اُن سے مِل کر بہُت خوش ہوا۔ آنکھیں اُن کے حُسنِ صوُرت سے رَوشن اور دِل اُن کے حُسنِ سیرت سے مسرُور ہوگیا۔

اِس تکلیف کی کیا ضرُورت تھی؟ مَیں یوں ہی خِدمت گُزاری کو حاضر ہوُں۔ جب چاہیں، اپنا کلام بھیج دیں۔ میرا اسلام اور یہ پیام کہہ دیجے گا۔

۱۳ر جولائی ۱۸۶۰ء — تمھارے دیدار کا طالب، غالبؔ

محمد زکریا خاں ذکیؔ دہلوی کے نام

بندہ پرور!

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ از روئے شرافتِ نسبی و لیاقتِ حسبی آفتاب و مہتاب ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے۔ اِس عُمر میں علم و فضل میں وہ پایۂ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسروں کو یہاں تک پہنچنا مُشکل ہے۔

مثنوی کے اشعار مَیں نے دیکھے اور پسند کیے۔ بہ طریقِ سہل مُمتنع کہے ہیں۔ اُردو فصیح، عبارت سلیس، الفاظ نہایت سنجیدہ و متین، حرف حرف شُستہ و رُفتہ، جو خوبیاں نظم میں چاہئیں، وہ سب مَوجود، مگر میری مدح میں اِتنا مُبالغہ کیوں کیا؟ مَیں تو اِقلیمِ سُخن کا گدائے خاک نشین ہوں، شہنشاہ کہاں سے ہو گیا۔ خیر، آپ کی ارادت میرے لیے مؤجبِ سعادت ہے۔ جو صاحب شعر میں خودستائی کو بُرا جانتے ہیں، کیا انھوں نے "یَجُوزُ لِلشَّاعِرِ مَا لَایَجُوزُ لِغَیْرِہٖ" نہیں سُنا ہے؟ یا اساتذۂ مُستند الکمال کا فخریہ کلام اُن کی نظر سے نہیں گزرا؟ اللہ اللہ! اِس امرِ خاص میں کیا کیا بلند پروازی اور اپنے کلام کی کیسے کیسے مدح طرازی کی ہے۔ رشید آسے عالمگیری کہتا ہے؛

چیست دانی بادۂ گلگوں؟ مُصفّا جوہرے
حُسن را پروردگارے، عشق را پیغمبرے

تین شعر، میں تین شاعروں کے بہ سبیلِ نمونہ یہاں لکھتا ہوں، باقی فائدہ کلامِ اہلِ سُخن پر حوالے کرتا ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے؛

بہ اِقلیم معنی رسول امینم
سنائی و فردوسی از اُمّتانم

دوسرا اُس سے بھی بڑھ کر کہتا ہے؛

بہ مُلکِ سُخن آں خدائے قدیرم   کہ معنی یکے باشد از بندگانم

تیسرا کچھ اور ہی راگ گاتا ہے۔

عوض کوثر کہ مشرب الرّوحست

نادوانے نہ پارگینِ منست

"نادواں" بمعنی "موری" اور "پارگیں" اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مطبخ اور حمام وغیرہ کا پانی جمع ہوتا ہے۔ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَطَحِیَاتِ الشُّعَرَاءِ۔

میر صاحب! میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں، اس پر امراضِ مُتضادّہ مُزمِنہ میں گرفتار، قویٰ بالکل مُضمحِل، اُٹھنا، بیٹھنا، لکھنا، پڑھنا سب مُشکِل۔ احیاناً اگر تحریرِ جواب میں تاخیر ہو جائے معاف رہوں۔ والسّلام مع الوفِ الاحترام۔

۲۹ر جنوری ۱۸۶۸ء دُعائے خیر کا طالب

بروز چہار شنبہ فقیر غالب

مولانا عباس رفعت کے نام

صاحب میرے، کرم فرما میرے، قدردان میرے، بلکہ فیض زادہ! میں قابل کسی ستائش کے نہیں ہوں۔ ایک ماتم زدۂ بے نوائے گوشہ نشین ہوں۔ حضرت یعقوب علیہ السّلام باآں کہ نبی تھے اور نفسِ مُطمئنہّ رکھتے تھے، ایک فرزند کے فِراق میں اِتنا روے کہ نابینا ہو گئے۔ اِس طُغیانِ قلزمِ خوں میں میرے ہزار معشوق ایسے ڈوبے کہ اُن کا پتا نہیں ملتا کہ کیا ہو گئے۔ ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ چالیس چالیس پچاس پچاس برس کے یار بچھڑ گئے، کوئی مجھ کو باپ کہتا تھا، کوئی مُرشِد جانتا تھا۔

سب کہاں، کچھ لالہ وگُل میں نُمایاں ہو گئیں
صورتیں کیا خاک میں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

بہ ہرحال مُردۂ مُتحرک ہوں۔ ایک پانو رکاب میں، ایک پانو زمین پر۔ اِرجعی اِلیٰ رَبِّک کی آوازِ دِل نواز کا مُنتظر۔ ہاں خِدمت گزاری احباب میں حاضر ہوں۔ اِستجازت کی حاجت نہیں۔ جب چاہیے، مُسوّدات اپنے بھیج دیجے۔ بعدِ حک و اِصلاح بھیج دیا کروں گا۔

یہ آپ نے بڑی مہربانی فرمائی کہ اپنے مسکن کا پتا لِکھ دِیا، ورنہ میں ارسالِ جواب میں مُتحیّر اور مُتردّد رہتا۔ مرزا یوسف علی خاں آپ کو سلام کہتے ہیں۔

صبحِ یک شنبہ، ۲۹ ربیع الثّانی ۱۲۷۸ھ
و ۳ نومبر سال حال ۱۸۶۱ء۔ نجات کا طالب۔ غالبؔ

شہزادہ بشیر الدّین کے نام

پیر و مرشد! سلامت۔

اعضا فرسودہ اور بودے ہو گئے۔ روح اُن میں دَوڑتی نہیں پھرتی۔ مگر ابھی مفارقت نہیں کرگئی۔ خدا جانے کس مکمن میں ہے؟ اعضا نکمّے ہو گئے۔ اب وہ کام جو اُن سے متعلق تھے، بند ہو گئے۔ آپ کا حکم ماننا اور آپ کی خدمت بجالانی دِل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ لطیفۂ غیبی یعنی روح کے کام ہیں۔ جب تک وہ باقی ہے، سرانجام پائے جائیں گے۔

"خاکم بہ دہن" واسطے اقوال کے ہے۔ جب کوئی کلمہ مکروہ طبع کہتے ہیں تو "خاکم بہ دہن" کہہ لیتے ہیں۔ عمر خیّام:

بر خاک بریختی مئے ناب مرا
خاکم بہ دہن، مگر تو مستی ربّی

"خاکم بہ سر" اور "خاکم بہ فرق" عام ہے، جیسا کہ میں ایک شہزادے کے مرثیے میں کہتا ہوں:

اے اہلِ شہر! مدفنِ ایں دودماں کجاست
"خاکم بہ فرق" خواب گہِ خسرواں کجاست

استاد:

"خاکم بہ سر" کہ عاشقِ کار آزمودہ ام
دانم کہ با رقیب بہ خلوت چہا رود

آپ کے ہاں اور مولوی روم کے ہاں "خاکم بہ دہن" کا موقع نہیں، جیسا کہ مولوی معنوی نے نہیں لکھا۔ حضرت بھی اپنے ہاں نہ لکھیں۔

فرق است درمیانہ کہ بسیار نازک است

نجات کا طالب، غالب

حکیم غلام نجف خاں کے نام

بھائی!

میرا دُکھ سُنو۔ ہر شخص کو غم مُوافق اُس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہّل میری مَوت ہے۔ مَیں کبھی اِس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سُبکی اور ذِلّت تھی، اگرچہ مجھ کو دَولتِ تنہائی میسّر آجاتی، لیکن اِس تنہائیِ چند روزہ اور تجریدِ مُستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لاولد رکھا تھا، شُکر بجالاتا تھا، خُدا نے میرا شکر قبوُل و منظوُر نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے، یعنی جس لوہے کا طوق، اُسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گیئں۔ خیر، اِس کا کیا رونا ہے؟ یہ قیدِ جاودانی ہے۔

جناب حکیم صاحب ایک روز از راہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوُں کہ اُن کے دیکھنے سے دِل کیا خوش ہُوا ہے۔ خُدا اُن کو زندہ رکھے۔ میاں! مَیں کثیر الاحباب شخص ہوُں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوُصًا اِس فِتنہ و آشوب میں تو شاید میرا کوئی جاننے والا نہ بچے گا۔ اِس راہ سے مجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں، بہُت عزیز ہیں۔ واللہ! دُعا مانگتا ہوں کہ اب احِبّا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی؛ کہ جو میَں مرُوں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دُنیا میں ہو۔

مصطفےٰ خاں کا حال سُنا ہوگا۔ خُدا کرے مُرافع میں چھوُٹ جائے ورنہ حبسِ ہفت سالہ کی تاب اُس ناز پروردہ میں کہاں؟ احمد حُسین مے کش کا حال کچھ تُم کو معلوم ہے یا نہیں؟ مخنوق ہُوا۔ گویا اِس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔

پنِسن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بہ شرطِ اِجرا بھی میرا کیا گزُارا ہوگا؟ ہاں، دو

باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام چوٗلھے دلدّر نہ ہوگا۔

تجھ کو میری جان کی قسم! اگر میں تنہا ہوتا، تو اِس وجہِ قلیل میں کیسا فارغ البال اور خوش حال رہتا۔ یہ بھی خبط ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ خُدا جانے پنسن جاری ہوگا، یا نہ ہوگا۔ اِحتمالِ تعیّش و تنعّم بہ شرطِ تجرید صورتِ اجراے پنسن سوچتا ہوں، اور وہ موہوم ہے۔ بیدل کا یہ شعر مجھ کو مزہ دیتا ہے:

نہ شامِ ما را سحر نویدی، نہ صبحِ ما را دمِ سپیدی
چو حاصلِ ماست نا امیدی غبارِ دنیا بہ فرقِ عقبیٰ

اِس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا، جو کچھ دِل میں تھا، وہ تم سے کہا۔ زیادہ کیا لکھوں؟

از غالب بہ نامِ جان و جاناں واز جان و جاناں
عزیز حکیم غلام نجف خاں سلّمہٗ اللہ تعالیٰ۔ ۱۸۵۸ء

(۲)

برخوردار سعادت و اقبال نِشان حکیم غلام نجف خاں کو میری دُعا پہنچے۔

تُمھاری تحریر پہنچی۔ تم جُداگانہ خط کیوں نہ لِکھا کرو؟ خط لِکھا اور بیرنگ پوسٹ پیڈ، جس طرح چاہا، اپنے آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھیج دیا۔ مکان کا پتا ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس، ڈاک منشی میرا آشنا۔ اب تم ایک کام کرو۔ آج یا کل دیوڑھی پر جاؤ، اور جِتنے خط جمع ہیں وہ لو، مان سنگی مضبوط کاغذ کا لِفافہ کرو، اور "بیرنگ" لِکھ کر کلیان کے ہاتھ ڈاک گھر میں بھجوا دو، اور اپنے خط میں جو حال شہر میں نیا ہو وہ مُفصّل لِکھو۔ جناب حکیم صاحب کو سلام و نیاز اور ظہیر الدّین احمد خاں کو دُعا کہنا۔

اب میرا حال سُنو۔ تعظیم و توقیر بہت، مُلاقاتیں تین ہوئی ہیں؛ ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مُشتمل ہے، رہنے کو مِلا ہے۔ یہاں پتھر تو دوا کو بھی میسّر نہیں،

خشتی مکان گنتی کے ہیں، کچّی دیواریں اور کھپریل۔ سارے شہر کی آبادی اِسی طرح پر ہے مُجھ کو جو مکان ملے ہیں، وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود اُن سے اِبتدا نہ کروں گا، وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے، مگر بہ واسطۂ کارپردازانِ سرکار دیکھوں کیا کہتے ہیں، اور کیا مُقرر کرتے ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی، لیکن آج تک، کہ جُمعہ آٹھواں دِن میرے پہنچنے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہُوا۔ کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غِذا میرے بھی خِلافِ طبع نہیں۔ پانی کا شکر کس مُنھ سے ادا کروں، ایک دریا ہے "کوسی" سُبحان اللہ! اِتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سُبک، گوارا، ہاضم، سریعُ النّفوذ۔ اِس آٹھ دِن میں قبض و اِنقباض کے صدمہ سے محفوظ ہوں۔ صُبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا۔ مگر ہاں، ایک عنایتُ اللہ دو دِن سے کچھ بیمار ہے، خیر، اچھا ہو جائے گا۔ والدُّعا۔

جُمعہ، ۳ فروری، سنہ ۱۸۶۰ء

نوّابُ انوارُ الدّولہ شفقؔ کے نام

پیر و مُرشد ! بارہ بجے تھے، میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقّہ پی رہا تھا، کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ بھلے کو انگر کھایا کُرتا گلے میں نہ تھا، اگر ہوتا تو میں گریباں پھاڑ ڈالتا حضرت کا کیا جاتا، میرا نقصان ہوتا۔ سرے سے سُنیے۔ آپ کا قصیدہ بعدِ اصلاح بھیجا۔ اُس کی رسید آئی۔ کئی کٹے ہوئے شعر اُلٹے ہوئے۔ اُن کی قباحت پوچھی گئی، قباحت بتائی گئی۔ الفاظِ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دیے گئے۔ لو صاحب! یہ اشعار بھی قصیدے میں لکھ لو۔ اِس نگارش کا جواب آج تک نہیں آیا۔ شاہ اسرارُالحق کے نام کا کاغذ اُن کو دیا۔ جواب میں جو کچھ اُنھوں نے زبانی فرمایا، آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا بھی جواب نہ مِلا۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے، تلف ہونا کسی طرح متصوّر نہیں۔ خیر اب بہت دِن کے بعد شکوہ کیا کیا جائے؟ باسی کڑھی میں اُبال کیوں آئے؟ بندگی بیچارگی۔

پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اِس شہر پر ہُوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اِس میں اہلِ شہر کا اِعتبار لُٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اِس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لُٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اِس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا، اِس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا۔ اِس میں تاب و طاقت عموماً لُٹ گئی، مرے آدمی کم، لیکن جس کو تپ آئی، اُس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی۔ اب تک اِس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مُبتلا ہیں، ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ۔ خُدا اِن دونوں کو جلد صحت دے۔ برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے۔ لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں۔ زمین دار خوش، کھیتیاں

تیّار ہیں۔ خریف کا بیڑا پار ہے۔ ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں مینھ درکار ہے۔ کِتاب کا پارسل پرسوں اِرسال کیا جائے گا۔

اہا ہا! جناب حافظ محمدّ بخش صاحب! میری بندگی۔

مُغل علی خاں غدر سے کچھ دِن پہلے مُستسقی ہوکر مر گئے۔ ہے ہے کیوں کر لکھوں! حکیم رضی الدّین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی ماردی اَور احمد حُسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اُسی دِن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے چھُٹی لے کر آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے، یہیں رہے۔ بعدِ فتحِ دہلی دونوں بے گُناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں، زِندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مُردے سے بھی بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحب زادہ میاں نِظامُ الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابرِ شہر بھاگے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودے میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سالِ گُزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے اُن کی صفائی ہوگئی، لیکن صرف جان بخشی۔ روشنُ الدّولہ کا مدرسہ جو عقبِ "کوتوالی چبوترہ" ہے وہ اَور "خواجہ قاسم کی حویلی" جس میں مُغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اَور "خواجہ صاحب کی حویلی" یہ اِملاک خاص حضرت کالے صاحب کی اَور کالے صاحب کے بعد میاں نظامُ الدّین کی قرار پاکر ضبط ہوئی، اَور نیلام ہوکر روپیہ سرکار میں داخل ہوگیا۔ ہاں "قاسم جان کی حویلی" جس کے کاغذ میاں نظام الدّین کی والدہ کے نام ہیں، وہ اُن کو یعنی نِظامُ الدّین کی والدہ کو مِل گئی ہے۔ فی الحال میاں نِظامُ الدّین پاک پٹن گئے ہیں، شاید بھاول پور بھی جائیں گے۔

(۱۸۶۰ء)

نواب ضیاء الدّین احمد خاں نیّرؔ و رخشاںؔ کے نام

جناب قبلہ و کعبہ! آپ کو دیوان دینے میں تاُمّل کیوں ہے؟ روز آپ کے مُطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اُس کو دیکھے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ ایک جلد ہزار جلد بن جائے، میرا کلام شُہرت پائے، میرا دِل خوش ہو، تمھاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں، تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گُزرے، اِتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں؟ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہونے لگی؛ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلّی تک [illegible] عرضِ راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیلِ ڈاک رام پور جاؤں گا، اور نواب فخر الدّین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لِکھا ہُوا دیوان تُم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ ابْ وہاں سے لے کر بھیج دو۔ وہ نہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے؟ ہاں، یہ لکھوں کہ نواب ضیاء الدّین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تُمھارے بھائی اور تُمھارے قریب ہو کر نہیں دیتے، تو میں اتنی دُور سے کیوں دوں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضّل سے لے کر بھیج دو۔ وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں؟ اگر دیں تو میرے کِس کام کا؟ پہلے تو ناتمام، پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اُس میں سے اور کے نام کر دیے گئے ہیں اور اس میں اُسی ممدوحِ سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدّین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے، اُس میں یہ دونوں قباحتیں مَوجود۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط، یہ کام تُمھاری مدد کے بِغیر انجام نہ پائے گا۔ اور تُمھارا کُچھ نقصان نہیں۔ ہاں، اِحتمالِ نقصان، وہ بھی از رُوئے وسوسہ و وہم۔ اُس صورت میں، میں تلافی کا کفیل، جیسا کہ اُوپر لکھ آیا ہوں۔ بہ ہرحال، راضی ہو جاؤ اور مُجھ کو لکھو تو میں طالب کو اِطّلاع دوں اور طلب اُس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔

رحم و کرم کا طالب، غالبؔ   ۱۸۶۲ء

منشی نبی بخش حقیر کے نام

بھائی صاحب!

یہ جو آپ نے لکھا کہ تیرے وہ اشعار سُنے جاتے ہیں کہ جو کبھی نہیں سُنے تھے۔ حال یہ ہے کہ میں نے اِن دِنوں میں دو غزلیں لکھی ہیں، ایک تو دریا نہ ہُوا، صحرا نہ ہُوا، وہ آپ کے پاس بھیج چُکا، دوسری غزل رواں کیوں ہو، گُماں کیوں ہو، وہ اب بھیجتا ہُوں۔ اِن دو غزلوں کے عِلاوہ حال میں کوئی غزل نہیں کہی۔ پس اگر اِس کے سِوا کوئی کُچھ آپ کے سامنے پڑھے، تو وہ یا میرا کلام نہ ہوگا، یا سابِق کی کوئی ایسی غزل ہوگی، کہ وہ آگے آپ نے نہ سُنی ہوگی۔

بندہ پرور! پندرہ روزوں کا اجر جو آپ نے مُجھ کو دِیا، وہ فوراً میں نے اُلٹا پھیر دیا۔ میرے کِس کام کا؟ نہ آم ہیں کہ کھاؤں، نہ شربت ہے کہ پیؤں۔

بھائی صاحب! اب کے تہنیتِ عید میں دو قصیدے کِس انداز کے لِکھے ہیں، کہ دیکھو گے تو حظ اُٹھاؤ گے۔ پرسوں یا اترسوں روانہ کرُوں گا۔ ہرگوپال صاحب کو بھی دِکھا دیجیے گا۔ رِسالدار کے گھر کے باب میں جو کُچھ تُم نے کہا، وہ مُطابِق واقعہ نہیں ہے، یعنی اُس نیک بخت نے ضِد سے یہ کام نہیں کِیا۔ غرض ایں حکایت را بیانے دیگر است۔ ایک زنِ مردافگن، بدروِش، بدفن نے اُس کو لوٹ کھایا۔ مہمان داری ہر روزہ و گُل و میوہ و نقش و نِگار و رنگ و بُو۔ یہ عیاشی وہ بدمعاشی ہے۔ آزردگی و دِل آزاری۔

میں اپنے بچّوں کو پیار کرتا ہُوں اور دُعائیں دیتا ہُوں۔ حُسین علی تُم کو بندگی اور بڑے بھائی منشی عبدُاللطیف کو آداب اور بہنوں کو سلام اور بھتیجا بھتیجی کو اِس راہ سے کہ وہ عُمر میں اور رِشتہ میں چھوٹے ہیں، دُعا کہتا ہے۔

بھائی صاحب! میں بھی تمھارا ہمدرد ہو گیا، یعنی منگل کے دِن ۱۸ ربیع الاوّل کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اُس کو ماں سمجھا تھا، اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں سے میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادی۔ یعنی اُس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں، اور اُس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مر گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

نگاشتہ، پنج شنبہ، ۲۰ ربیع الاوّل (۱۲۰۷ھ) ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء

از اسداللہ

سیّد بدرالدّین احمد المعروف بہ فقیر المتخلّص بہ کاشف کے نام

پیر و مرشد!

آج نواں دن ہے، حسین مرزا صاحب کوالور گئے۔ اگر ہوتے تو اُن سے پوچھتا کہ حضرت میرا دیوان کس مطبع میں طبع ہوا؟ اور حاشیے اُس پر کس نے چڑھائے؟ خدا جانے حسین مرزا نے کیا کہا، اور حضرت کیا سمجھے۔ اب یہ حقیقت مجھ سے سُنیے۔ ۱۸۶۲ء یعنی سالِ گزشتہ میں "قاطعِ برہان" چھپی۔ پچاس جلدیں میں نے مول لیں، اور یہ وہ زمانہ ہے کہ آپ دِلّی آئے ہیں۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تمھارے کس کام کی ہے، تمھیں نہ دی۔ تم مانگتے اور میں نہ دیتا تو گنہ گار تھا۔ اب کوئی جلد باقی نہیں ہے۔ رہا دیوان۔ اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو، تو وہ اِس عرصے میں دِلّی اور کان پور دو جگہ چھاپا گیا۔ اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے۔ فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا، جب چھپا تھا، پھر نہیں چھپا سال گزشتہ میں منشی نول کشور نے شہاب الدّین خاں کو لکھ کر "کلّیاتِ فارسی" جو ضیاءُ الدّین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا، وہ منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو ہیں۔ یعنی کوئی مصرع میرا اُس سے خارج نہیں۔ اب سُنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہات آجائے تو "۶۵" بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔ جب آجائیں گی، ایک آپ کو بھیج دوں گا۔ نواب محیُ الدّین خاں صاحب کا حال سُن کر جی بہت خوش ہوا۔ میری طرف سے سلام و نیاز کے بعد مبارک باد دینا۔

(ستمبر ۱۸۶۳ء)

چودھری عبدالغفور سرور کے نام

چودھری صاحب شفیقِ مکرم کی خدمت میں بعد ارسالِ سلامِ مسنون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرّہ پروری اور درویش نوازی کی، ورنہ میں سزاوارِ ستائش نہیں ہوں ایک سپاہی زادہ ہیچ مداں اور پھر دِل افسردہ، دوراں فشردہ۔ ہاں ایک طبعِ موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں، اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیبِ الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پردازی میں میرا قول اکثر خلافِ جمہور پائیے گا، اور حق بہ جانبِ میرے ہوگا۔

پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں، کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں، اور اِن کا کلام وحی ہے؟ اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ اِن کا قیاس غلط ہے، مگر یہ بھی نہیں کوئی کہہ سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔ اُسی چھاپے میں کہ جس کا آپ حوالہ دیتے ہیں "من کہ باشم عقل کل الخ" اِس شعر کی شرح کو مُلاحظہ کیجیے۔ عبارت وہ تعقید سے لبریز کہ مقصود شارح کا سمجھا بھی نہیں جاتا، اور جب غور و خوض کے بعد سمجھ لیجیے تو وہ معنی ہرگز لائق اِس کے نہیں ہیں کہ فکرِ سلیم اُس کو قبول کرے۔ پھر "احسانِ تو بشگافتہ الخ" اِس مِصرع کی توجیہ کتنی بے مزہ اور بے نفع ہے۔ عُرفی کو کہاں سے لاؤں جو اُس سے پوچھوں کہ بھائی! تو نے اِس شعر کے کیا معنی رکھے ہیں

دیوانگریِ محبّتِ تو کامروز مسلّم است مارا
دیوانہ ز تاج کرد تارک آوارہ ز کفش کرد مارا

جیسا کہ دُوسرے شعر کے مفہوم کو شارح کہتا ہے کہ دیوانگی میں یہ حالت بعید نہیں۔ ایسا

ہی اگر کوئی کہے، منصبِ دیوانی سے یہ بات بعید ہے، تو پھر شارح کیا جواب دے گا؟
ہاں یہ کہے گا کہ غلبۂ محبّت میں پاسِ وضع نہ رہا۔ اور دیوان جی صاحب کچہری سے ننگے سر اور ننگے پاؤں نکل بھاگے۔ ہم نے مانا، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ "دیوانگی" کیوں نہ لکھیں؛ کہ دوسرے شعر کے معنی بے تکلّف اور منطبق ہو جائیں، اور توجیہات درمیان نہ آئیں۔
فقیر کے نزدیک "دیوانگیِ محبّت" تو صحیح اور بے تکلّف ہے، اور دیوانگی و محبّت غلط محض، اور دیوانگریِ محبّت تو تکلّفِ محض۔ دیوانگی و محبّت دو صفتیں کیوں جمع کریں؟ غور کیجیے۔ عطفِ واؤ یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص پہلے سے دیوانہ تھا، پھر اُسی حالت میں اُس کو محبّت پیدا ہوئی۔ دیوانگی میں تاج و کفش بیجا تھی۔ محبّت پیدا ہونے کے بعد یہ حالت طاری ہوئی ہے۔ کیا بے مزہ توجیہ ہے۔ ہاں "دیوانگیِ محبّت" یعنی وہ جنون جو فرطِ محبّت میں بہم پہنچا، اُس نے اِس احوال کو پہنچایا۔ فقیر "دیوانگیِ محبّت" کہے گا، اور "دیوانگی و محبّت" کہنے کو منع کرے گا، اور "دیوانگریِ محبّت" کہنے کو نہ مانع آئے گا اور نہ تسلیم کرے گا۔ زیادہ اِس سے کیا عرض کروں؟ یاد آوری اور مہر گستری کا شکریہ بجا لاتا ہوں اور بس۔
اب یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحبِ عالم کی طرف ہے۔ اپنے مخدوم و مطاع حضرت صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں اور حیران ہوں کہ اور کیا کہوں ... ؟ ع

تا ہر چہ گفتی از تو مکرّر شنودمے

شُدے کی رعایت سے کہ وہ بہ یائے مجہول ہے بہ معنی می شُد۔ اکثر صاحب گفتی کو بھی بہ یائے مجہول پڑھتے ہیں تاکہ "می گفت" کے معنی پیدا ہوں۔ اِس صورت میں خطاب بہ طرف غیبت کے رجوع کرتے ہیں، اور "گفتی" بہ یائے معروف کہ صیغۂ واحد حاضر ہے از منہ میں سے، اشعار زمانۂ ماضی رکھتا ہے، اور "شدن"، "شود" یہ سب اِستقبال کے مقتضی ہیں، اور معروف "گفتی"، ماضی ہے۔ پس اگر "گفتی" بہ یائے معروف کہیے تو اوپر کے مصرع میں "بدی" کہنا ہوگا۔ بودی کا مخفف۔ خلاصہ یہ کہ اگر وہاں "بدی" کہیے

تو یہاں "گُفتی" بہ یاے معرُوف بے تکلّف درست اور بہ یاے مجہُول غلط ہے، اور اگر وہاں "شُدے" کہیے تو یہاں "گُفتے" بہ یاے مجہُول کہیے۔ غیبت اور خِطاب کا تفرقہ مِٹا دیجیے۔ "گُفتے" بہ یاے مجہُول میں خِطابِ حاضِر مُقرّر رہتا ہے، اور تُو کا لفظ جو قریب ہے اِس معنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ نظائرِ اِس کے فارسی میں بہُت ہیں۔ رُباعی کے باب کی پُرسِش ہرگز نہ رہے۔ نہیں کہی۔ زیادہ حدّ ادب۔

خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام

حضرت پیر و مرشد! ناظرینِ "قاطع برہان" پر روشن ہوگا کہ "نامراد"، اور "بے مراد" کا ذکر مبنی اس پر ہے کہ عبدالواسع ہانسوی "بے مراد" کو صحیح اور "نامراد" کو غلط لکھتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کہ ترکیبیں دونوں صحیح، لیکن "بے مراد" غنی کو کہتے ہیں، اور "نامراد" محتاج کو۔ آپ کے نزدیک اگر دونوں کا محلِ استعمال ایک ہی ہو تو میرا مدّعائے اصلی یعنی "نامرادی" کی ترکیب کا علی الرّغم عبدالواسع کے صحیح ہونا فوت نہیں۔ شعرِ مرزا صائب

نامرادی زندگی بر خویش آساں کردنست

ترکِ جمعیّتِ دل خود را بہ ساماں کردنست

یہاں "نامرادی" "بے مرادی" کے معنی کیوں کر دے گی؟ اغنیا خواہ اہلِ توکّل، خواہ اہلِ تموّل متمولین پر بھی کام آسان نہیں ہوتا، بلکہ مفلسوں سے زیادہ اُن پر مشکلیں ہیں۔ رہے اہلِ توکّل، اُن کی صفتیں اور ہیں۔ وہ اہل اللہ ہیں، مقرّبانِ بارگاہِ کبریا ہیں۔ دُنیا پر پُشتِ پا مارے ہوئے ہیں، کام اِن پر کب مشکل تھا، کہ انھوں نے آسان کر دیا۔ نامراد صیغۂ مفرد ہے مساکین کا۔ اصنافِ مساکین کی شرح ضروری نہیں۔ سختی کشی و بے نوائی، کوتہ دستی و گدائی، یہ اوصاف ہیں مساکین کے۔ اِن صفات میں سے ایک صفت جس میں پائی جاوے وہ مسکین نامراد۔ البتّہ مساکین پر نہ ایک کام بلکہ سب کام آسان ہیں۔ نہ پاسِ ناموس و عزّت نہ حُبِّ جاہ و تمکنت۔ نہ کسی کے مُدّعی نہ کسی کے مُدّعا علیہ۔ دِن رات میں دو بار روٹی ملی، بہت خوش، ایک بار ملی بہ ہر حال خوش۔ خُدا کے واسطے مولانا صائب کے شعر میں سے "نامراد" بہ معنی "کسے کہ ہیچ مراد نہ داشتہ باشد" کیوں کر ثابت ہوتا ہے؟ مساکین کی زندگی جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، آسان گزرتی ہے یا اغنیا کی؟ رہا مولوی

معنوی علیہ الرحمہ کا یہ شعر ہے

عاقلاں از بے مُرادی ہائے خویش

باخبر گشتند از مَولائے خویش

مَیں نے مثنوی کے ایک نسخہ میں "عاقلاں" کی جگہ "عاشقاں" دیکھا ہے۔ بہ ہر صورت معنی یہ ہیں کہ عُشّاق یا عُقلا بعدِ ریاضتِ شاقّہ، ماسوائے اللہ سے اِعراض کر کے بے مُراد اور بے مُدعا ہو گئے۔ یہ پایۂ تسلیم و رضا ہے۔ البتّہ اِس رُتبہ کے آدمی کو خُدا سے لگاؤ پیدا ہو گا۔ ع

باخبر گشتند از مَولائے خویش

یہاں بھی بے مُرادی سے نامرادی کے معنی نہیں لیے جاتے، مگر ہاں ع

بے مرادی مومناں از نیک و بد

دوسرا مِصرعہ ع

در بہ کُلّی بے مُرادت داشتے

اِن دونوں مِصرعوں میں نامُراد اور بے مُرادی کے معنی میں غلط واقع ہو گیا ہے۔ خیر "بے مُراد" اور "نامُراد" ایک سہی، ہر چند دوسرے مِصرع مولوی میں "بے مراد" کے معنی "بے حاجت" کے درُست ہوتے ہیں مگر ع

من کہ رِندم شیوۂ من نیست بحث

زیادہ تکرار کیوں کروں؛ مع ہذا مصرعۂ اوّل کی کچھ توجیہ بھی نہیں کر سکتا۔ "نامُراد" کی ترکیب کی صحت علی الرّغم عبدُالواسع ثابت ہو گئی۔ فثبت الدّعا۔ کمال یہ کہ مانندِ "ناچارا" و "بے چارا" اور "ناانصاف" و "بے اِنصاف" کے "نامراد" اور "بے مُراد" کا بھی مورد اِستعمال مُشترک رہا۔ والسّلام

اکادمی کی شائع کردہ یونی ورسٹی سطح کی نصابی کتابیں

منتخب غزلیں		۱۰/۵۰
منتخب نظمیں		۶/
انتخابِ افسانہ		۱۰/-
انتخابِ نثر (حصہ اوّل)		۴/-
انتخاب نثر (حصہ دوم)		۵/-
انتخاب منظومات (حصہ اول)		۵/۵۰
انتخاب منظومات (حصہ دوم)		۷/-
بکٹ کہانی	مرتبۂ نورالحسن ہاشمی	۲/۵۰
انارکلی	امتیاز علی تاج	۸/-
ابتدائی اردو	حکم چند نیّر	۴/-
انتخاب غبارِ خاطر	ابوالکلام آزاد	۳/-
انتخاب مراثی		۷/-
انتخاب قصائد		۳/-
انتخاب خطوطِ غالب		۳/-
لازمی نصاب	حکم چند نیّر	۵/۵۰

ملنے کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی، قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

فون نمبر: ۲۲۳۱۴۲